عبادت و نماز
استاد شہید مرتضیٰ مطہری

ہماری پیاری باجی

سیدہ شمیم زہرا نقوی

بنت

سید نوازش علی نقوی (مرحوم)

اور محترم بھائی

شہید سید قمر رضا نقوی

ابن

سید نوازش علی نقوی (مرحوم)

اور جملہ مرحومین و شہدائے ملت

دعا فرمایئے کہ

پروردگار عالم چہاردہ معصومینؑ کے
صدقے میں مرحومین کے درجات بلند فرمائے
اور انکو جوار آئمہ معصومینؑ میں جگہ عطا فرمائے
اور ان کی تمام لغزشوں اور کوتاہیوں کو درگزر فرمائے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

عبادت ونماز

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

ترجمہ

سید سعید حیدر زیدی

پیشکش

سید جاوید رضا نقوی

نام کتاب : **عبادت ونماز**

مؤلف : استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

ترجمہ : سید سعید حیدر زیدی

بشکریہ : دار الثقلین، ناظم آباد، کراچی۔

پیشکش : سید جاوید رضا نقوی

تاریخ اشاعت : اکتوبر ۲۰۱۲ء

تعداد اشاعت : ۱۰۰۰

سرورق ڈیزائننگ : سید امتیاز عباس

پرنٹنگ : العصر پبلشرز، ناظم آباد، کراچی

فہرست

✿✿✿

عرضِ ناشر

زیرِ نظر رسالہ عبادت اور نماز کے موضوع پر استاد شہید مرتضیٰ مطہری کی چار تقاریر کا مجموعہ ہے۔ یہ تقاریر رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ میں حسینیہ ارشاد تہران میں کی گئیں۔ ان تقاریر میں شہید مطہری نے اسلام میں عبادات و معنویات کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے' خداوندِ عالم پر ایمان اور عبادات کے تربیتی اثرات پر گفتگو کی ہے اور فقط انہی میں ڈوب کے رہ جانے' یا انہیں یکسر نظر انداز کر دینے کی نفی کرتے ہوئے اسلام کے ایک جامع اور دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی اور فلاح کے طالب دین ہونے کی وکالت کی ہے۔

تقریر اور تحریر' اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کے دو ذرائع ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا علیحدہ انداز اور مخصوص اثر ہوا کرتا ہے۔ مقرر اپنی حرکات و سکنات اور چشم و ابرو کی جنبش کے ذریعے بھی پیغام دیتا ہے' جبکہ تحریر اس سہولت سے محروم ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی تقریر کو اسکی پوری تاثیر کے ساتھ قلم بند کرنا ممکن نہیں۔ زیرِ نظر تقاریر کا ترجمہ کرتے ہوئے کوشش کی گئی ہے کہ انکا تقریری انداز بھی محفوظ رہے اور ان میں کی جانے والی گفتگو بھی تحریر کی صورت میں پوری پوری پہنچ جائے۔ ہم اس کوشش میں کس حد تک کامیاب رہے اس سے ہمیں قارئین مطلع کریں گے۔

امید ہے ہماری دوسری مطبوعات کی طرح یہ کتاب بھی قارئین میں مقبول ہوگی۔

ابتدائیہ

تمام تعریفیں خدائے بزرگ و برتر کے لئے ہیں۔ جو کائنات کا پروردگار ہے اور زمین و آسمانوں میں اور ان کے درمیان اسی کی حکمرانی ہے۔

بہترین درود و سلام اس کے تمام مقرب بندوں خاص طور سے کائنات کے سید و سردار آقائے دو جہاں خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے پاک و پاکیزہ اہلبیت طاہرین علیہم السلام پر۔

قارئین محترم ہم اپنی واجب الاحترام والدین سید نوازش علی نقوی اور حسن بانو (چاندی) کی اٹھارویں برسی کے موقع پر عظیم المرتبت استاد شہید مرتضٰی مطہری کی تحریر کردہ کتاب "عبادت و نماز" پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ پروردگار ہماری اس سعی کو اپنی بارگاہ میں قبول و مقبول فرما اور اس کتاب کو ہمارے والدین کے لئے توشۂ آخرت قرار دے۔

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ عظیم فقیہ، عالم، استاد شہید مرتضٰی مطہری دینی و ادبی حلقوں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں انہوں نے اپنی تحریروں میں تفسیر قرآن، فلسفہ، اخلاقیات، عمرانیات، تاریخ اور کئی ایک موضوعات پر قلم اٹھایا ان کی تمام تصنیف کا حقیقی مقصد اسلام پر کئے گئے اعتراضات کا جواب دینا اور دوسرے مکاتب فکر کی خامیاں اور اسلام کی عظمت واضح کرنا تھا۔ انہوں نے مخالف نظریات رکھنے والوں کو بحث و مباحثے

کی دعوت بھی دی۔ ملحدانہ مکاتب فکر کے پیروکاروں کے لئے استاد مطہری کی سرگرمیاں ناقابلِ برداشت تھیں، چنانچہ انہوں نے آپ کو دہشت گردی کے ذریعے منظر عام سے ہٹادینے کا فیصلہ کیا۔ بالآخر وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہوئے اور استاد مطہری یکم مئی ۱۹۷۹ء کو ۶۰ برس کی عمر میں شہید کردیئے گئے۔

استاد مطہری اسلامی دنیا کے دینی اور ادبی حلقوں کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ وہ ایک عرصے تک تہران یونیورسٹی میں شعبہ الٰہیات اور معارفِ اسلامی کے سربراہ رہے شہادت کے وقت وہ اسلامی جمہوری ایران کی دستور ساز کونسل کے صدر کے عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر بہت سے معرکۃ الآراء کتابیں لکھی ہیں جو فارسی، عربی، ترکی، اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوچکی ہیں۔

عبادت و نماز ان کی بہترین تصانیف میں سے ایک ہے جو کہ ان کی چار تقاریر کا مجموعہ ہے یہ تقاریر رمضان المبارک ۱۳۹۰ ہجری میں حسینیہ ارشاد تہران میں کی گئیں۔ ان تقاریر میں شہید مطہری نے اسلام میں عبادات اور معنویات کی اہمیت پر روشنی ڈالی، خداوندِ عالم پر ایمان اور عبادات کے تربیتی اثرات پر گفتگو کی اور فقط انہی میں ڈوب کے رہ جانے یا انہیں یکسر نظر انداز کردینے کی نفی کرتے ہوئے اسلام کے ایک جامع اور دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی اور فلاح کے طالب دین ہونے کی وکالت کی ہے۔

دین کے بارے میں غلط تصور کو رد کرتے ہوئے شہید مطہری فرماتے ہیں:

''ایک گروہ کا کہنا ہے کہ: اَلصَّلوٰۃُ عَمُودُ الدِّین (نماز دین کا ستون ہے) والی بات کسی بھی طرح اسلامی تعلیمات سے موافق نہیں۔ کیونکہ دین اسلام تو سب چیزوں سے زیادہ اجتماعی مسائل کو اہمیت دیتا ہے۔ اسلام تو اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱) کا دین ہے۔ اسلام تو لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتَابَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۲) کا دین ہے۔ اسلام تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دین ہے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (۳) اسلام جہدِ مسلسل اور کوشش اور عمل کا دین ہے۔ اسلام ایک عظیم دین ہے۔

ایک ایسا دین جو مذکورہ مسائل کو اتنی اہمیت دیتا ہے، کیسے ممکن ہے کہ وہ عبادت کے لئے اتنی زیادہ اہمیت کا قائل ہو؟ نہیں، دین اسلام میں عبادت کے مسئلے کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔ ہمیں اسلام کی اخلاقی اور اجتماعی تعلیمات کے نفاذ کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ عبادت بے کار لوگوں کا مشغلہ ہے۔ جنہیں کوئی اہم ترین کام نہ ہو وہ نماز پڑھیں، وہ عبادت کریں۔ لیکن ایک ایسا شخص جس کے سامنے اہم ترین کام ہوں اسکے لئے لازم نہیں کہ وہ عبادت بجالائے۔

یہ بھی ایک غلط فکر ہے اور انتہائی خطرناک۔ اسلام کو اس طرح سمجھنا چاہئے، جیسا کہ وہ ہے۔

قرآنِ مجید جہاں کہیں بھی اقیموا الصلاۃ کہتا ہے، اسکے فوراً بعد آتو الزکاۃ کہتا ہے۔ اگر اقام الصلاۃ کہتا ہے تو اسکے بعد آتی الزکاۃ کہتا

ہے۔ جب یقیمون الصلاۃ کہتا ہے تو اسکے بعد یوتون الزکاۃ کہتا ہے۔ یقیمون الصلاۃ کا تعلق بندے اور خدا کے درمیان رشتے سے اور یوتون الزکاۃ کا ربط بندگانِ خدا کے آپس کے تعلقات سے ہے۔

جس طرح ایک مردِ مسلمان کو اپنے اور اپنے رب کے درمیان ایک مستقل اور مسلسل رابطے کی ضرورت ہے اسی طرح اسکے لئے ضروری ہے کہ اپنے اور اپنے معاشرے کے درمیان بھی ایک مستقل اور مسلسل رابطہ قائم رکھے۔

بغیر عبادت کے، بغیر ذکرِ الٰہی کے، بغیر یادِ خدا کے، بغیر مناجات کے، بغیر حضورِ قلب کے، بغیر نماز کے، بغیر روزے کے ایک اسلامی معاشرہ تشکیل نہیں پاسکتا، حتیٰ خود انسان بھی سالم نہیں رہ سکتا۔

اسی طرح بغیر ایک سالم معاشرے کے، بغیر ایک سالم ماحول کے، بغیر امر بالمعروف کے، بغیر نہی عن المنکر کے، بغیر مسلمانوں سے پیار و محبت کے اور بغیر دوسروں کی مدد اور ان کے ساتھ تعاون کے انسان ایک اچھا عبادت گزار بندہ نہیں بن سکتا''۔

اس بہترین کتاب کی اشاعت کے موقع پر میں دار الثقلین کے جناب سید سعید حیدر زیدی کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا اور قلیل وقت میں اس کا مسودہ فراہم کیا۔ اللہ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ اسی کے ساتھ محترم جناب سید امتیاز رضا زیدی (بوتراب اسکاؤٹس) کا خصوصی شکریہ، جن کا تعاون ابتداء ہی سے ہر مرحلے پر شاملِ حال رہتا ہے۔

العصر پبلشرز کے محترم ثقلین رضا کا شکریہ۔ جو ہماری کتابوں پر خصوصی توجہ دے کر انہیں حسین سے حسین تر صورت میں آپ تک پہنچانے کیلئے طباعت کے سارے مراحل کی نگرانی فرماتے ہیں۔

جناب امتیاز عباس کا شکریہ جو اس کی ڈیزائننگ، اور تزئین و آرائش کی ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ، پورا کرتے ہیں۔

خدائے بزرگ و برتر ان تمام حضرات کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور انہیں دنیا و آخرت میں اس کا بہترین اجر عطا فرمائے۔

اور آخر میں تمام مومنین و مومنات سے التماس ہے کہ ہمارے والدین سید نوازش علی نقوی اور حسن بانو (چاندی) اور ہماری پیاری باجی سیدہ شمیم زہرا نقوی اور بالخصوص محترم بھائی شہید سید قمر رضا نقوی کے لئے ایک مرتبہ سورۂ فاتحہ اور تین مرتبہ سورۂ اخلاص کی تلاوت فرما کر شکر گذار فرمائیں۔ اور دعا فرمائیں کہ مالکِ دوجہاں اِن مرحومین کی قبر پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور انہیں جنت الفردوس کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔

آمین

والسلام محتاج دعا

سید جاوید رضا نقوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عبادت ونماز

(۱)

الحمد للہ رب العالمین باریٔ الخلائق اجمعین والصلاۃ والسّلام علی عبداللّٰہ ورسولہ وحبیبہ وصفیّہ وحافظ سرّ ومبلّغ رسالاتہ سیّدنا ونبیّنا ومولانا ابی القاسم محمد صلی اللّٰہ علیہ والہ وسلم وعلی الہ الطّیّبین الطّاھرین المعصومین'اعوذ باللّٰہ من الشّیطان الرّجیم:

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ."(۱)

جیسا کہ آپ نے سنا' مجھے آج رات یہاں تقریر نہیں کرنی تھی۔ میری تقریر کل رات سے شروع ہونی تھی۔ آئندہ پانچ راتوں کے لیے جس موضوعِ بحث کا اعلان ہوا تھا وہ مسئلہ' "عبادت ودعا" تھا۔ اس ماہ کی مناسبت سے' جو ماہِ مبارکِ رمضان ہے' ماہِ عبادت ودعا ہے' اور بالخصوص اِن ایام اور شبوں کی مناسبت سے' جو ایام وشبہائے قدر ہیں' یہ شبیں احیا کی شبیں ہیں' یعنی وہ راتیں ہیں جن میں سنت ہے کہ ہم ان راتوں کو جاگ کر گزاریں۔

۱۔اے ایمان والو!صبر اور نماز کے ذریعے مدد مانگو۔(سورۂ بقرہ ۲۔آیت ۱۵۳)

''احیا''یعنی زندہ کرنا' اور ان شبوں میں احیا کے معنی ہیں' ان شبوں کو جاگ کر گزارنا' ان میں شب بیداری کرنا۔ اس مناسبت سے طے یہ تھا کہ ہم عبادت اور دعا کے بارے میں گفتگو کریں (لیکن) تقدیر میں یہ تھا کہ یہ گفتگو آج ہی رات سے شروع ہو جائے۔

احیا

ہم اپنی بحث کا آغاز اسی کلمے ''احیا'' سے کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ''احیا'' یعنی زندہ کرنا' اسکی ضد ''اماتہ'' ہے' یعنی مارنا۔ اس لفظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رات' جو انسان کے وقت کا ایک حصہ ہے' اسکی دو حالتیں ہیں' ممکن ہے کسی کی شب زندہ ہو' اور ممکن ہے اسکی شب مردہ ہو۔ زندہ شب' وہ شب ہے جس میں انسان پوری رات' یا کم از کم اس رات کے ایک حصے کو ذکرِ الٰہی' مناجات اور ذاتِ پروردگار سے راز و نیاز میں بسر کرے۔ اور مردہ شب' وہ شب ہے جس میں انسان تمام رات پروردگار کی مقدس ذات سے غفلت اور فراموشی کی حالت میں رہے۔

ممکن ہے کوئی یہ خیال کرے کہ یہ تعبیر ایک مجازی تعبیر ہے۔ ایک قسم کا تکلف ہے۔ کوئی رات زندہ اور مردہ نہیں ہوتی' رات آخر رات ہے' وقت ہے۔ وقت کا وہ حصہ جس میں کرۂ زمین کا وہ نصف حصہ جس پر ہم زندگی بسر کرتے ہیں سورج کے سامنے نہیں ہوتا اور اس پر سورج کی روشنی نہیں پڑتی'

اسے رات کہا جاتا ہے۔ رات بہر صورت رات ہے' رات کی نہ زندگی ہوتی ہے اور نہ اسکی موت۔

یہ بات صحیح ہے۔ لیکن وہ شخص جو کہتا ہے کہ احیا' رات میں جاگتے رہنا' اسکی مراد یہ نہیں ہے کہ آپ وقت کے اس حصے کو جگا کے رکھے' بلکہ جاگے رہنے سے مراد وقت کے اس حصے میں خود آپ کا جاگے ہونا ہے۔

اور زیادہ دقیق عبارت میں' جیسا کہ ابتدا تصور ہوتا ہے اسکے برخلاف' ہم خیال کرتے ہیں کہ وقت ایک چیز ہے جس کے اندر ہم سب داخل ہیں' جبکہ ایسا نہیں ہے۔ وہ وقت جس کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ہم سب اسکے اندر داخل ہیں' وہ ہمارا وقت نہیں ہے۔ وہ وقت جس کی بنیاد پر ہم حساب لگاتے ہیں' گھنٹوں' منٹوں' ہفتوں' مہینوں اور سالوں کا حساب کرتے ہیں' وہ ہمارا وقت نہیں ہے' وہ اس زمین کا وقت ہے۔ ہمارا وقت ہمارے اپنے وجود سے متحد ایک حقیقت ہے' ہمارے وجود کا حصہ ہے۔ ہمارا وقت' ہمارے وجود کا وقت' خود ہم سے علیحدہ اور جدا نہیں ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ ہم اس وقت کا حساب' جس کی ایک مقدار ہوتی ہے' زمین کے وقت سے کرتے ہیں' اس کے مطابق کرتے ہیں' اسکے بعد یہ تصور کرتے ہیں کہ وقت ایک چیز ہے اور ہم سب اسکے اندر ہیں۔ نہیں میرا وقت ایک چیز ہے اور آپ کا وقت ایک دوسری چیز ہے۔ یعنی وہ خود آپ سے مخصوص ہے۔ اسی طرح جیسے آپ کا قد مثلاً ایک

سو ساٹھ سینٹی میٹر ہے' یہ کمیت اور مقدار آپ کی چیز ہے' اور میرا قد جو ایک سو ستر سینٹی میٹر ہے' وہ مجھ سے مخصوص ہے۔ آپ کا ایک قد اور سائز ہے' اور میرا بھی اپنا ایک مخصوص قد اور سائز ہے (اب یہ ایک دوسرے کے برابر ہوں یا نہ ہوں' ایک علیحدہ بات ہے) آپ کا وجود کیونکہ ایک متحرک' سیال اور متغیر وجود ہے' اس لئے خود آپ کے اپنے اندر ایک وقت ہے اور میں بھی اپنے اندر ایک وقت رکھتا ہوں۔ وہ پھول بھی اپنے اندر ایک وقت رکھتا ہے' وہ درخت بھی اپنے اندر ایک وقت رکھتا ہے' یہ پتھر بھی اپنے اندر ایک وقت رکھتا ہے۔ اور ہر چیز کے اندر پایا جانے والا وقت' عین اس چیز کا وجود ہوتا ہے۔

اب جبکہ ہم نے اس نکتے کو سمجھ لیا ہے' شب قدر میں احیا کے معنی بھی ہماری سمجھ میں آگئے ہیں۔ وقت کو زندہ رکھیں' یعنی ہم خود اپنے وقت کو زندہ رکھیں' ہم میں سے ہر ایک اپنے اندر موجود وقت کو زندہ رکھے۔

وہ وقت جو ہمارے اندر موجود ہے' وہ کیا ہے؟

وہ خود ہم ہیں' ہم سے جدا کوئی چیز نہیں ہے۔ پس ہم خود اپنے وقت کو خود اپنی شب کو زندہ رکھیں۔ یعنی ہم خود ایک رات واقعاً زندہ رہیں' واقعاً زندہ بسر کریں' نہ کہ مردہ بسر کریں۔

اخبار و احادیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن انسان پر گزرنے والی چیزوں کو' اُس پر گزرنے والے زمانے کو انسان کے سامنے پیش کیا جائے گا'

اور وہاں مختلف انسان نظر آئیں گے۔ کبھی انسان کو ایک ایسا موجود دکھائی دے گا جس کا کچھ حصہ سیاہ اور تاریک ہے اور کچھ حصہ سفید اور چمکدار۔ اس سے مختلف ایک انسان اپنے آپ کو دیکھے کہ اُس کا زیادہ تر حصہ سیاہ ہے' جبکہ ایک اور انسان دیکھے گا کہ اُس کا بیشتر حصہ سفید اور براق ہے۔ ممکن ہے کوئی انسان ایسا بھی ہو جسے اپنے اندر صرف چند ہی سیاہ نقطے دکھائی دیں' پورا کا پورا سفید نظر آئے' جبکہ ایک دوسرا اسکے برعکس ہو اور وہ اپنے اندر صرف چند ہی سفید نقطے دیکھے' بقیہ پورا کا پورا اسے سیاہ نظر آئے۔

وہ تعجب کرے گا (اور پوچھے گا) کہ یہ کیا چیز اسکے سامنے پیش کی گئی ہے؟ کہیں گے کہ: یہ تمہارا وقت ہے' یہ تمہاری عمر ہے۔ وہ لمحات جن میں تم نے اس وقت کو' اس عمر کو روشن اور نورانی رکھا تھا' ان لمحات میں جب تم محو پرواز تھے' جذبے اور ولولے کے ساتھ تھے' عشق کے ہمراہ تھے' تمہارا دل اپنے خدا کی یاد سے زندہ تھا' وہ لمحہ' وہ نورانی اور چمکدار لمحہ ہے۔ وہ لمحہ جب تم نے کسی کی خدمت کی تھی' کوئی مفید کام انجام دیا تھا' وہ تمہارا نورانی لمحہ ہے۔ لیکن وہ لمحہ جس لمحے میں تم غافل رہے تھے' شہوات میں غرق رہے تھے' تم نے خدا کی رضا کے برخلاف قدم اٹھایا تھا' وہ تمہاری عمر کے سیاہ اور تاریک اوقات ہیں۔ یہ تمہارا وقت ہے' تمہاری عمر ہے۔

روحِ عبادت یادِ خدا

یادِ خدا' روحِ عبادت ہے۔ عبادت کی روح یہ ہے کہ جب انسان عبادت کررہا ہو' کوئی نماز پڑھ رہا ہو' کوئی دعا کررہا ہو الغرض کوئی بھی عمل انجام دے رہا ہو' تو اس کا دل اپنے خدا کی یاد میں زندہ ہو: وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (۱) قرآن کہتا ہے نماز قائم کرو۔ کس لئے؟ اس لئے کہ میری یاد میں رہو۔ ایک دوسری جگہ قرآنِ کریم فرماتا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ وَ لَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (۲) اس آیت میں نماز کی خاصیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ البتہ وہ نماز جو حقیقی ہو' جو واقعی نماز ہو' ایسی نماز ہو جو صحیح شرائط اور آداب کے ساتھ ادا کی گئی ہو۔ فرماتا ہے: اگر انسان حقیقتاً نماز پڑھنے والا ہو اور صحیح نماز پڑھے' تو خود نماز انسان کو نازیبا کاموں اور منکرات سے روکتی ہے۔ محال ہے کہ انسان درست اور مقبول نماز پڑھے اور جھوٹا ہو۔ محال ہے کہ انسان صحیح اور درست نماز پڑھے اور اس کا دل غیبت کرنے کو چاہے۔ محال ہے کہ انسان درست اور صحیح نماز پڑھنے والا ہو اور اس کی شرافت اسے شراب خوری کی طرف جانے کی اجازت دے' وہ بے حیائی کی طرف جائے' کسی بھی دوسرے نازیبا کام کی طرف قدم اٹھائے۔ نماز کی خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو عالمِ نورانیت کی طرف لے جاتی ہے۔

۱۔ اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔ (سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۱۴)

۲۔ نماز ہر برائی اور بدکاری سے روکنے والی ہے اور اللہ کا ذکر بہت بڑی شے ہے۔ (سورۂ عنکبوت ۲۹۔ آیت ۴۵)

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک روایت ہے' جو معروف کتاب ''مصباح الشریعہ'' میں نقل ہوئی ہے۔ ہمارے پاس ''مصباح الشریعہ'' نامی ایک کتاب ہے' جسے بہت سے بزرگ علما معتبر سمجھتے ہیں' جبکہ بعض علما' جیسے مرحوم (علامہ) مجلسی' اس کتاب کو خاص معتبر نہیں سمجھتے' اس اعتبار سے کہ اسکے مضامین کچھ عرفانی مضامین پر مشتمل ہیں۔ البتہ یہ ایک معروف کتاب ہے۔ حاجی نوری' سید بن طاؤس اور ان جیسے دوسرے حضرات اس کتاب سے نقل کرتے ہیں۔ اس کتاب میں بکثرت احادیث ہیں۔

فضیل بن عیاض نام کا ایک شخص ہے' امام جعفر صادق علیہ السلام کا معاصر ہے' اُس کا شمار معروف لوگوں میں ہوتا ہے' ایک ایسا شخص ہے جس نے اپنی عمر کا ایک حصہ گناہ' فسق و فجور' چوری' ڈاکے اور اسی قسم کے دوسرے مشاغل میں بسر کیا ہے۔ بعد میں اس میں ایک عجیب روحانی انقلاب پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنی بقیہ عمر (اپنی آدھی عمر) تقویٰ' زہد' عبادت اور معرفت و حقیقت کی تلاش میں بسر کرتا ہے۔ اسکی داستان معروف ہے۔ وہ ایک مشہور چور تھا' نقب زن' وہ خود اپنی داستان کچھ یوں بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے: ایک رات میں نے ایک گھر کو نظر میں رکھا ہوا تھا' کہ آج رات اس گھر میں چوری کروں گا۔ اس گھر کی دیوار بلند تھی۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ میں دیوار کے اوپر چڑھا' جب میں دیوار کے اوپر پہنچا اور چاہا کہ نیچے اتروں' تو ہمسائے کے کسی گھر میں (یا اسی گھر

کے اوپر) ایک عابد' زاہد اور متقی شخص' ایسے لوگوں میں سے ایک شخص جو اپنی راتوں کو بیداری کے عالم میں بسر کرتے ہیں' قرآن پڑھنے میں مشغول تھا' بہت اچھے انداز اور انتہائی خوبصورت لحن کے ساتھ (۱) جب میں دیوار کے اوپر پہنچا تو اتفاقاً قرآن کا وہ قاری اور عابد شخص اس آیت پر تھا: اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ (۲)

ظاہر ہے فضیل عرب تھا' معنی سمجھتا تھا۔

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ: کیا وہ وقت نہیں آیا جب باایمان لوگوں کے دل' ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کے دل' خدا کی یاد قبول کرنے کے لئے نرم ہو جائیں؟

۱۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآن کو تجوید کے ساتھ پڑھنا (تجوید یعنی خوبصورت بنانا) یعنی حروف کی صحیح ادائیگی کے ساتھ پڑھنا' اچھے انداز میں پڑھنا' ایسا انداز جو الحانِ اہلِ فسق نہ ہو' ایک ایسے انداز سے پڑھنا جو قرآن سے تناسب رکھتا ہو قرآنی سنتوں میں سے ہے اور ہمارے ائمہ اطہار علیہم السلام خود اس میدان میں دوسروں سے آگے تھے۔ ہماری روایات میں ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام سجاد علیہ السلام انتہائی خوبصورت آواز میں قرآن پڑھا کرتے تھے۔ جب گھر کے اندر سے آپ کے قرآن پڑھنے کی آواز بلند ہوتی' تو یہ آواز سن کر گلی سے گزرنے والوں کے قدم وہیں جم کے رہ جاتے (اس زمانے میں مدینہ میں سقے گھروں میں پانی پہنچایا کرتے تھے) کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سقے پانی کی مشکیں اٹھائے ہوئے' باوجود یہ کہ انہیں زحمت کے ساتھ اٹھائے ہوتے تھے' جب وہاں پہنچتے تو یہ بھاری بوجھ اُٹھائے ہونے کے باوجود قرآن کی یہ دلنشیں تلاوت سننے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ وہ عابد شخص اس قرآنی سنت کے ساتھ مطابق آدھی رات کے وقت قرآن کی تلاوت میں مشغول تھا اور اپنے کمرے میں خوش الحانی کے ساتھ قرآنِ مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔

۲۔ کیا صاحبانِ ایمان کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ان کے دل ذکرِ خدا اور اُس کی طرف سے نازل ہونے والے حق کے لئے نرم ہو جائیں۔ (سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۱۶)

کب تک قساوت قلبی رہے گی؟ کب تک غفلت و بے خبری رہے گی؟ کب تک غنودگی کی حالت طاری رہے گی؟ کب تک حرام خوری میں مبتلا رہیں گے؟ کب تک دروغ گوئی اور غیبت کریں گے؟ کب تک شراب خوری اور قمار بازی کے مرتکب رہیں گے؟ کب تک نافرمانی میں مصروف رہیں گے؟

یہ خدا کی آواز ہے' اسکے مخاطب بھی ہم تمام لوگ ہیں۔ خدا ہم سے بات کر رہا ہے۔ اے میرے بندے' اے مسلمان! وہ وقت کب آئے گا جب یادِ خدا کے لئے تیرا دل نرم ہو جائے' جب تو خدا کی یاد کے لئے خاضع اور خاشع ہو جائے؟

اس عابد شخص نے اس انداز سے اس آیت کو پڑھا کہ فضیل' جو دیوار پر چڑھا ہوا تھا' اُسے یوں محسوس ہوا کہ خود خدا اپنے بندے فضیل سے مخاطب ہے۔ وہ کہتا ہے: اے فضیل! تو کب تک چوری اور ڈاکازنی اور لوٹ مار کرے گا؟

یہ آیت سُن کر فضیل لرز کر رہ گیا اور یکلخت پکار اٹھا: خدایا! بس اب وہ وقت آن پہنچا ہے۔ پھر وہ اُسی وقت دیوار سے اتر آیا اور توبہ کی' سچی توبہ' ایسی توبہ جس نے اُس شخص کو اوّل درجے کا عبادت گزار بنا ڈالا۔ اس حد تک کہ تمام لوگ اُس کا احترام کرنے لگے۔

وہ ایسا شخص نہ تھا جو ہارون الرشید کے دربار میں حاضری دے۔ ہارون

الرشید کو فضیل بن عیاض سے ملاقات کی بڑی آرزو تھی' لیکن کہتے ہیں کہ فضیل کبھی ہارون کے دربار میں نہیں آتے تھے۔ ہارون کہتا ہے کہ اگر فضیل نہیں آتے' تو میں چلا جاتا ہوں۔ ایک مرتبہ وہ فضیل کے پاس گیا۔ وہ ہارون ہے' ایک مقتدر خلیفہ ہے' دنیا میں بہت کم بادشاہ ایسے گزرے ہیں جن کی مملکت کی وسعت اس کی مملکت کے برابر ہو وہ دنیا کے مقتدر ترین سلاطین میں سے ایک ہے۔ ایک فاسق اور فاجر شخص ہے۔ ایک ایسا شخص ہے جو رات رات بھر شراب نوشی' رقص و سرود اور اسی قسم کی باتوں میں مشغول رہا کرتا ہے۔ وہ فضیل کے پاس آتا ہے۔ وہی فضیل اپنی گفتگو کے چند جملوں سے (اسے منقلب کر دیتے ہیں) وہاں موجود تمام لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے دیکھا کہ فضیل کے سامنے ہارون انتہائی چھوٹا دکھائی دے رہا تھا' اور اسکی آنکھوں سے آنسو برسات کی طرح جاری تھے۔ فضیل اُسے وعظ و نصیحت کر رہے تھے' اسکے سامنے اسکے ایک ایک گناہ کو گنوا رہے تھے۔ فضیل بن عیاض اس قسم کے شخص تھے۔ وہ اس حالت میں' جو انہوں نے اس دور میں پیدا کی' تقویٰ اور معرفت کے اس درجے پر پہنچ گئے' امام جعفر صادق علیہ السلام کے معاصر تھے اور انہوں نے ہارون یعنی امام موسیٰ ابن جعفر (الکاظم) کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔

کتاب ''مصباح الشریعہ'' ایک ایسی کتاب ہے کہ ان کا دعویٰ ہے کہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور امام سے چند مسائل

کے بارے میں سوال کیا اور امام نے مجھے یہ جوابات دیئے۔ ظاہر بات ہے کہ جب اس قسم کا عارف' با معرفت' متقی اور زاہد انسان امام کی خدمت میں حاضر ہوگا' تو یہ کسی ایسے ساربان کے آپ کی خدمت میں جانے سے بہت مختلف ہوگا جو مثلاً شکیات (نماز) کا کوئی مسئلہ آپ سے پوچھنا چاہتا ہو۔ قدرتی طور پر اسکے سوالات' ایک درجہ بلند تر ہوں گے اور امام کے جواب بھی دوسروں کو دیئے جانے والے جوابات سے ایک درجہ بلند سطح کے ہوں گے۔ قدرتی طور پر یہ کتاب ایک بلند درجہ کتاب ہے۔ مثلاً امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس کتاب میں اسرارِ وضو بیان کیے ہیں' اسرارِ نماز بیان کیے ہیں۔

امام جعفر صادق کی ایک حدیث

وہ جملہ جس سے ہم استدلال کر رہے ہیں' وہ اس کتاب میں ہے۔ اور آپ نے اس جملے کو کم وبیش عرفانی کتب میں دیکھا ہوگا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فضیل سے فرمایا: یا فُضَیلُ اَلْعُبُودِیَّۃُ جَوْھَرَۃٌ کُنْھُھَا الرُّبُوبِیَّۃُ (انتہائی عجیب جملہ ہے' اور ایک لحاظ سے ہلا دینے والا جملہ بھی ہے) فضیل! کیا تم جانتے ہو کہ عبودیت کیا ہے؟ کیا جانتے ہو عبودیت کیسا گوہر ہے؟ عبودیت ایک ایسا گوہر ہے کہ اس کا ظاہر عبودیت ہے اور اس کا کنہ' نہایت اور باطن' اسکی آخری منزل اور ہدف ربوبیت ہے۔

ممکن ہے آپ کہیں کہ اس سے کیا مراد ہے؟ کیا امام جعفر صادق علیہ

السلام یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ عبودیت کی ابتدا بندگی ہے اور اسکی انتہا خدائی؟ کیا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک بندہ' بندگی کے راستے خدائی تک پہنچ جاتا ہے؟ نہیں' ائمہ علیہم السلام کی تعبیروں میں کسی صورت اس قسم کی کوئی تعبیر نہیں آ سکتی۔ اہلِ عرفان دوسرے لوگوں پر طنز کرنے کے لئے' جو معانی نظر میں رکھتے ہیں' کچھ تعبیریں استعمال کرتے ہیں' تاکہ دوسرے ہل کے رہ جائیں' انہیں جھٹکا لگے' یہ ایک طرح سے لوگوں کو چھیڑنا ہوتا ہے۔ مثلاً مولانا روم یا شبستری کے یہاں اس قسم کی تعبیریں ملتی ہیں شبستری کہتے ہیں:

مسلمان گر بدانستی کہ بت چیست

بدانستی کی دین در بت پرستی است

یہ انتہائی عجیب بات ہے۔ لیکن اس سے مراد وہ نہیں ہے جو اسکے الفاظ سے ظاہر ہو رہی ہے۔ یہ شعر ایک صحیح مراد کا حامل ہے۔ ایک مقام پر اُس نے کہا ہے کہ بقول خود اُس کے اُس نے زاہد نما افراد کو چھیڑا ہے۔ ایک معروف شعر ہے' جسے مولانا روم سے منسوب کیا جاتا ہے' مجھے نہیں معلوم یہ مثنوی میں ہے یا نہیں۔ کہتے ہیں:

از عبادت می توان اللہ شد

نی توان موسیٰ کلیم اللہ شد

انتہائی عجیب (کلام) ہے۔ کہتے ہیں کہ عبادت کے ذریعے موسیٰ کلیم

اللہ نہیں بنا جا سکتا لیکن عبادت کے ذریعے اللہ بنا ممکن ہے امراد کیا ہے؟ یہ حدیث جس کے ہم آپ کے لئے معنی کر رہے ہیں' اسکی روشنی میں اس شعر کے معنی بھی واضح ہو جائیں گے۔

دراصل ربوبیت کے معنی ہیں تسلط' خداوندگاری' البتہ خدائی نہیں۔ خدائی اور خداوندگاری کے درمیان فرق ہے۔ خداوندگاری' یعنی مالک ہونا' صاحبِ اختیار ہونا۔ اصحاب الفیل کے قصے میں جب ابرھہ کعبہ کو مسمار کرنے کی غرض سے آیا' تو وہ وہاں بیابان میں موجود حضرت عبدالمطلب کے اونٹوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ عبدالمطلب ابرھہ کے پاس گئے۔ حضرت عبدالمطلب کے قیافے' شخصیت اور عظمت نے ابرھہ کو انتہائی متاثر کیا' یہاں تک کہ وہ سوچنے لگا کہ اگر اس مردِ بزرگ نے سفارش کی اور مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں کعبہ کے خلاف اقدام نہ کروں' اور اسے نہ ڈھاؤں' تو میں اسے مسمار نہیں کروں گا۔ لیکن اسکی توقع کے برخلاف' جب حضرت عبدالمطلب نے بات کی تو فقط اپنے اونٹوں کے بارے میں گفتگو کی' کعبہ کے بارے میں ایک لفظ تک نہ کہا۔ ابرھہ کو تعجب ہوا' وہ بولا: میں تو آپ کو انتہائی بزرگ انسان سمجھا تھا' میرا خیال تھا کہ آپ کعبہ کی سفارش کرنے کے لئے آئے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ آپ تو اپنے اونٹوں کی سفارش کر رہے ہیں۔ حضرت عبدالمطلب نے بھی اسے ایک خوبصورت جواب دیا۔ فرمایا: اَنَا رَبُّ الْاِبِلِ وَ لِلْبَیْتِ

رَبُّ (میں اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے)

''رب'' یعنی مالک۔ ہم جو خدا کو رب کہتے ہیں' تو اس عنوان سے کہ وہ تمام عالم اور تمام عالموں کا مالکِ حقیقی ہے۔ ہم کہتے ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. شکر و سپاس اس خدا کے لئے جو مالک ہے' تمام عالموں کا مالک ہے۔ پس ''رب'' کے حقیقی معنی ہیں مالک اور خداوندگار اور ربوبیت یعنی خداوندگاری' خدائی نہیں۔ خدائی اور خداوندگاری کے درمیان فرق ہے۔ جو کوئی جس چیز کا مالک ہے' وہ اس چیز کا رب اور خداوندگار بھی ہے۔

اب اس حدیث کے کیا معنی ہیں' جس میں امام نے فرمایا ہے کہ:

عبودیت ایک ایسا جوہر ہے جس کی انتہا اور کنہ ربوبیت ہے۔

ایک نہایت خوبصورت نکتہ ہے۔ عبودیت اور خدا کی بندگی کی خاصیت یہ ہے کہ جس قدر انسان خدا کی بندگی کے راستے کو زیادہ طے کرتا ہے' اسی قدر اُس کے تسلط' قدرت اور خداوندگاری میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کس طرح؟ ہم اس نشست میں فقط ایک انتہائی چھوٹا سا موضوع آپ کی خدمت میں عرض کر رہے ہیں' اس کے بعض دوسرے مسائل کی ایک فہرست عرض کر رہے ہیں لیکن ایک موضوع کو کھول رہے ہیں۔

ربوبیت کا اوّلین درجہ: اپنے نفس پر تسلط

عبودیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ربوبیت اور خداوندگاری کا

اوّلین درجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے نفس کا رب اور مالک ہو جاتا ہے' اپنے نفس پر تسلط اور غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ ہماری بے چارگیوں میں سے ایک بے چارگی' جسے ہم مکمل طور پر محسوس کرتے ہیں' یہ ہے کہ: ہمارے نفس کی لگام خود ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی' ہم اپنے آپ پر اختیار نہیں رکھتے' اپنی زبان پر اختیار نہیں رکھتے' اپنی شہوت پر اختیار نہیں رکھتے' اپنے شکم پر اختیار نہیں رکھتے' اپنی شرم گاہ پر اختیار نہیں رکھتے' اپنی آنکھ پر اختیار نہیں رکھتے' اپنے کان پر اختیار نہیں رکھتے' اپنے ہاتھ پر اختیار نہیں رکھتے' اپنے پیر پر اختیار نہیں رکھتے۔ اور یہ ہماری انتہائی بدبختی ہے۔ ہم ان گلی کوچوں میں چلتے پھرتے ہیں لیکن یہ آنکھ ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی' {بلکہ} ہم اس آنکھ کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ یعنی ہم ہیں کہ اس آنکھ کا دل چاہتا ہے کہ نظر بازی کرے' اس کا دل چاہتا ہے کہ لوگوں کی عزتوں پر شہوت کی نگاہ ڈالے اور ہمارا دل بھی اس انکھ کے تابع ہو جاتا ہے:

دل بروو چشم چو مایل بوو

دست نظر رشتہ کش دل بوو

ہم خود اپنی زبان کے مالک نہیں ہیں' ہمیں اپنی زبان پر اختیار نہیں ہے۔ جب گرم ہوتے ہیں' تو اصطلاحاً ہمارا دماغ گھوم جاتا ہے اور ہم جو دل میں آتا ہے بول ڈالتے ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے کہ کیا بول رہے ہیں' ایسی

حالت میں نہ اپنے رازوں کی حفاظت کر پاتے ہیں نہ لوگوں کے اسرار کی۔ اس حالت میں ہم لوگوں کے عیب نہیں چھپا پاتے' اپنے آپ کو لوگوں کی غیبت سے نہیں روک پاتے۔۔۔۔(۱) ہم اپنے کانوں پر بھی اختیار نہیں رکھتے' جو چیز ہمارے کانوں کو اچھی لگے' مثلاً انہیں غیبت اچھی لگتی ہے' تو ہم بھی اسکے سامنے سر جھکا دیتے ہیں' انہیں لہو ولعب پسند ہے' تو ہم بھی تسلیم ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے ہاتھ پر اختیار نہیں رکھتے' اپنے پیر پر اختیار نہیں رکھتے' اپنے غصے پر اختیار نہیں رکھتے' کہتے ہیں (خود میں بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ہوں) جناب! اب مجھے غصہ آ گیا ہے' جو میرے منہ میں آئے گا کہہ ڈالوں گا۔ مجھے غصہ آ گیا ہے' یعنی کیا؟ یعنی میں ایک ایسا آدمی ہوں جو اپنے نفس کا مالک نہیں ہوں' جوں ہی مجھے غصہ آتا ہے' میرا کنٹرول اسکے ہاتھ میں چلا جاتا ہے' جو میرے منہ میں آتا ہے' کہہ ڈالتا ہوں' کیونکہ میں غصے میں ہوں۔ ایک اور شخص ہے' جو اپنی نفسانی خواہشات کا مالک نہیں ہوتا۔ کیا انسان کو اپنے نفس کا مالک نہیں ہونا چاہئے؟ جب تک ہم اپنے نفس کے مالک نہ ہوں' کیا مسلمان ہو سکتے ہیں؟ نہیں' مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے نفس کا مالک ہو۔

دوسرا درجہ: نفس کے خیالات کا مالک ہونا

یہاں تک ہم نے اس درجے کے بارے میں گفتگو کی' اب ہم اس سے

۱۔ یہاں چند سیکنڈ کی تقریر ریکارڈ نہیں ہو سکی ہے۔

بلند ایک درجے پر چلتے ہیں۔ ہمیں اپنے نفس میں آنے والا خیالات کا اپنے ضمیر کے خیالات کا مالک (ہونا چاہیے) اس مسئلے پر مکمل طور پر توجہ کی ضرورت ہے۔

ہم میں سے وہ لوگ جو اپنی آنکھ کے مالک ہیں' اپنی زبان کے مالک ہیں' مضبوط قوتِ ارادی کے مالک ہیں' اپنے ہاتھ کے مالک ہیں' اپنے پیر کے مالک ہیں' اپنی زبان کے مالک ہیں' اپنی شہوت کے مالک ہیں' اپنے غصے کے مالک ہیں' وہ ایک چیز کے مالک نہیں ہیں۔ ہم لوگ جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں' ہم میں سے کوئی ایک بھی فرد (اگر یہاں اولیاء اللہ موجود ہوں' تو مجھے نہیں معلوم) اپنے ذہنی اور نفسانی خیالات کا مالک نہیں ہے۔ یعنی کیا؟ یعنی ہمارے ذہن میں آنے والے مفاہیم و معنی ہمارے اختیار کے بغیر اس شاخ سے اُس شاخ پر اور اُس شاخ سے اِس شاخ پر اڑتے پھرتے ہیں۔ ہمارے خیال کی قوت ایک چڑیا کی مانند ہے۔ آپ نے درختوں پر بیٹھی چڑیا کو دیکھا ہوگا' وہ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدکتی رہتی ہے' تیزی کے ساتھ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اڑتی پھرتی ہے' ہمارے خیال کی قوت بھی مسلسل اِس شاخ سے اُس شاخ پر اڑتی ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ برائے مہربانی اپنے ذہن کو دس منٹ کے لئے ایک نکتے پر مرکوز کر دیجئے۔ صرف ایک موضوع کے بارے میں غور و فکر کیجئے۔ کیا ہمارے لئے ممکن ہے؟؟!

ہم اور آپ سے کہا جاتا ہے کہ جب آپ نماز پڑھیں' تو آپ کا ذہن

اسی جانب مرکوز رہے اور آپ میں حضورِ قلب پایا جائے "لا صَلوٰۃَ اِلّا بِحُضُورِ الْقَلْب" حضورِ قلب کے بغیر نماز قبول نہیں ہے۔ صحیح ہے یعنی آپ سے یہ نہیں کہیں گے کہ آپ نے نماز کیوں نہیں پڑھی، لیکن ایسی نماز قبول نہیں ہے۔ یعنی (ایسی نماز) آپ کو کسی مقام پر نہیں پہنچاتی، آپ کے لئے کسی خاصیت کی حامل نہیں ہوتی۔ جوں ہی ہم اللہ اکبر کہتے ہیں، اگر بالفرض ہم دکاندار ہیں، تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے اپنی دکان کا تالا کھول لیا ہے، حمد اور سورہ پڑھتے ہیں، لیکن ہمارا دل دکان میں لگا ہوتا ہے، ہمارا دھیان دفتر میں ہوتا ہے، ہمارا دل اپنی فلاں ملکیت میں اٹکا ہوتا ہے، فلاں شہوت کے پیچھے ہوتا ہے۔ ہم اچانک اُس وقت ہوش میں آتے ہیں، جب "السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ" کہہ رہے ہوتے ہیں۔

ہم نے (اس انداز سے) اس قدر زیادہ نمازیں پڑھی ہیں کہ یہ ہماری عادت سی ہو چکی ہے۔ ہم اپنی اِس روش کو ترک نہیں کر پاتے۔ خودکار انداز میں "اللہ اکبر" سے "السلام علیکم" تک پہنچ جاتے ہیں اور بغیر کچھ سمجھے بوجھے (نماز کو) ختم کر لیتے ہیں۔ حالانکہ نماز کے دوران حضورِ قلب اور ذہن کا مرکوز ہونا ضروری ہے۔ آپ یہ نہ کہیے گا کہ یہ ناممکن بات ہے۔ نہیں، ممکن ہے، بہت زیادہ ممکن ہے۔ اگر آپ عبودیت (اَلْعُبُودِیَّۃُ جَوْھَرَۃٌ کُنْھُھَا الرُّبُوبِیَّۃُ) کے ساتھ کوشش کریں، عبودیت کی راہ میں قدم اٹھائیں، تو واقعاً آپ ایسی نماز

پڑھ سکتے ہیں جو اگر پانچ منٹ کی ہو تو ان پورے پانچ منٹ میں آپ صرف خدا کی طرف متوجہ ہوں' آپ دس منٹ نماز پڑھیں تو خدا کی طرف متوجہ ہوں۔ اصلاً آپ کا ذہن خدا کے سوا کسی اور چیز کی طرف متوجہ ہی نہ ہو' آدھے گھنٹے' ایک گھنٹے (اسی حال میں رہیں) اور پھر رفتہ رفتہ بعض اولیاء اللہ کی مانند ہو جائیں اور ابتدائے شب سے صبح تک مسلسل عبادت کریں اور آپ کا ذہن خدا کے سوا کسی بھی چیز کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اس قدر غرق ہوں کہ اگر کوئی آ کر عین آپ کے سر پر کھڑا ہو کے شور و غل بھی مچائے' تب بھی آپ نہ سنیں' نہ سمجھیں اور اسکی جانب متوجہ نہ ہوں' آپ کا ذہن اس قدر مرکوز ہو جائے۔

حالتِ نماز میں امام سجاد کا حضورِ قلب

امام سجاد علیہ السلام عبادت میں مشغول تھے۔ آپ کا ایک بچہ چھت سے نیچے گرا اور اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ عورتیں جمع ہو گئیں اور چیخنے چلانے لگیں کہ بچے کا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔ جا کر بازو جوڑنے والے کو لاؤ' لوگ گئے اور اعضا جوڑنے والے کو بلا لائے اور بچے کا ہاتھ باندھ دیا۔ بچہ رویا' عورتوں نے آہ و فغاں کی' دوسرے افراد نے بھی چیخ پکار مچائی' بات ختم ہو گئی' قصہ گزر گیا۔ عبادت سے فارغ ہونے کے بعد امام صحن میں تشریف لائے' اُن کی نگاہ اپنے بچے پر پڑی' دیکھا اُس کا ہاتھ بندھا ہوا ہے' آپ نے پوچھا یہ کیا ہوا؟ لوگوں نے بتایا: بچہ چھت سے گر گیا تھا' اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا' ہم اعضا جوڑنے والے

کو لائے' اُس نے اِس کا ہاتھ باندھ دیا' اُس وقت آپ نماز اور عبادت میں مشغول تھے۔ امام نے قسم کھا کر کہا کہ مجھے بالکل پتا نہیں چلا۔

ممکن ہے آپ کہیں کہ وہ امام زین العابدین علیہ السلام تھے' ہر آدمی تو ان کی مانند نہیں ہو سکتا۔ خود ہم نے اپنی زندگی میں ایسے افراد کو دیکھا ہے (البتہ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس حد اور اس درجے تک) ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ نماز شروع کرنے کے وقت سے لے کر اسکے اختتام تک ذکرِ خدا اور یادِ خدا میں اس طرح ڈوب جاتے' اور نماز میں اس طرح غرق ہو جاتے کہ اپنے ارد گرد سے یکسر بے خبر ہو جاتے تھے! ہم نے ایسے افراد کو دیکھا ہے "اَلْعُبُودِیَّةُ جَوْهَرَةٌ كُنْهُهَا الرُّبُوبِيَّةُ" عبودیت اور بندگی کا نتیجہ اور اس کا اوّلین اثر یہ غلبہ اور تسلط ہے۔

ہم نے اِس نشست میں تسلط کے دو مرحلوں کے بارے میں عرض کیا ہے۔ تسلط کا ایک درجہ' جو تسلط کا کم سے کم درجہ ہے' اور اگر یہ انسان میں پیدا نہ ہو' تو انسان کو یقین رکھنا چاہئے کہ اسکی عبادتیں درگاہِ الٰہی میں مقبول نہیں ہیں {اور یہ درجہ} اپنے نفس پر تسلط ہے۔ یہ وہی چیز ہے کہ قرآن نماز کے بارے میں کہتا ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ (۱) نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔

۱۔ نماز ہر بُرائی اور بدکاری سے روکتی ہے۔ (سورۂ عنکبوت ۲۹۔ آیت ۴۵)

نماز کس طرح بے حیائی اور بُرے کاموں کا راستہ روکتی ہے؟

کیا نماز پولیس ہے کہ جب آپ کسی بُرے کام کی طرف جانا چاہتے ہیں تو وہ ڈنڈا لئے آ کر آپ کا راستہ روک لیتی ہے؟ نہیں نماز عبودیت اور بندگی ہے۔ اس عبودیت کا نتیجہ ربوبیت اور تسلط ہے۔ اور تسلط اور غلبے کا کم از کم درجہ نفس پر تسلط اور غلبہ ہے۔

تقویٰ

تقویٰ سے کیا مراد ہے؟

یعنی اپنے آپ کو بچانا، محفوظ رکھنا۔

اپنے آپ کو بچانے سے کیا مراد ہے؟

مراد ہے اپنے نفس پر تسلط۔

"اِنَّ تَقْوَی اللهِ حَمَتْ اَولیاءَ اللهِ مَحارِمَهُ وَاَلْزَمَتْ قُلُوبَهُمْ مَخافَتَهُ." (۱) حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں' تقوائے الٰہی کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہ انسان کو محرماتِ الٰہی سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسکی دوسری خاصیت یہ ہے کہ یہ انسان کے دل میں خدا کا خوف بٹھاتا ہے۔ قرآنِ مجید روزے کے بارے میں کہتا ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ. (۲)

۱۔ تقویٰ ہی نے اللہ کے دوستوں کو حرام کئے گئے کاموں سے بچایا ہے اور اُن کے دلوں میں خوف پیدا کیا ہے۔ (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۱۴)

۲۔ صاحبانِ ایمان تم پر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۸۳)

اے اہلِ ایمان! تمہارے لئے روزہ فرض کیا گیا ہے' اسی طرح جیسے تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا۔ کیوں؟ قرآن روزے کا مقصد بھی بیان کرتا ہے: "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْن" "اس لئے کہ تمہارے اندر تقویٰ کی روح اور تقویٰ کا ملکہ پیدا ہو جائے۔

تقویٰ کے ملکہ سے کیا مراد ہے؟

مراد ہے نفس پر تسلط۔ نفس پر تسلط وہی چیز ہے جس کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: "اَلْعُبُودِيَّةُ جَوْهَرَةٌ كُنْهُهَا الرُّبُوبِيَّةُ."

پس اگر ہم نے ماہِ رمضان گزار لئے ہیں' احیا کی راتوں {شبہائے قدر} کو گزار لیا ہے' مسلسل روزوں کو گزار لیا ہے' اور ماہِ رمضان کے بعد اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں کہ ہم اب اپنی شہوات پر اس سے زیادہ مسلط ہیں جیسے ہم ماہِ رمضان سے پہلے ان پر مسلط تھے' اپنے غصے پر پہلے سے زیادہ مسلط ہیں' اپنی آنکھوں پر ہمیں زیادہ قابو ہو گیا ہے' اپنی زبان پر پہلے سے زیادہ کنٹرول ہے' اپنے اعضا و جوارح پر زیادہ مسلط ہیں' مختصر یہ کہ اپنے نفس پر زیادہ مسلط ہیں اور ہم نفس امارہ کا راستہ روک سکتے ہیں' تو یہ ہمارے روزے کی قبولیت کی علامت ہے۔

لیکن اگر ماہِ رمضان گزر گیا' ختم ہو گیا' اور ماہِ رمضان سے ہمارا حاصل

(جیسا کہ پیغمبر اکرم نے فرمایا ہے کہ روزے سے بعض لوگوں کو صرف بھوک اور پیاس حاصل ہوتی ہے) صرف یہ ہو کہ ہم نے ایک مہینے بھوک اور پیاس برداشت کی ہے (اکثر کیونکہ ہم لوگ سحر و افطار کرتے ہیں' اس لئے بھوک اور پیاس بھی نہیں لگتی۔ البتہ ہم کم از کم بے حال تو ہو ہی جاتے ہیں) ایک مہینے تک بے حالی کا شکار رہے' اور اِس بے حالی کے نتیجے میں کام کے لئے ہماری توانائی کم ہو گئی' اور کیونکہ کام کاج کے لئے ہماری قوت و توانائی کم ہو گئی' تو آکے روزے پر الزام لگاتے ہیں کہ اِس روزے کی وجہ سے ہماری کارکردگی کم ہوئی۔ (جو طالبِ علم ہے وہ کہتا ہے کہ پورے ماہِ رمضان میں میری پڑھنے کی قوت کم ہو گئی' جو کوئی اور کام کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ میری فلاں کام کی طاقت کم ہو گئی۔ پس روزہ ایک بُری چیز ہے) یہ ہمارے روزے کے قبول نہ ہونے کی علامت ہے۔ جبکہ اگر انسان ماہِ رمضان میں واقعی معنی میں روزہ رکھنے والا ہو' اگر واقعاً اپنے آپ کو بھوکا رکھے' اگر جیسا کہ کہا گیا ہے تین وقت کے کھانے کو دو وقت کا کرلے۔ یعنی پہلے وہ ناشتہ' دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا کھاتا تھا' اب دوپہر کا کھانا نہیں کھائے' اسکی افطار ایک ناشتے کی مانند مختصر ہو' اسکے بعد سحر کے وقت معدے پر بہت زیادہ بوجھ نہ ڈالے' بلکہ ایک معمول کی غذا کھائے' تو اسے احساس ہوگا کہ کاموں کے سلسلے میں اسکی جسمانی قوت میں بھی اضافہ ہوا ہے' اور کارِ خیر کے لئے اسکی روحانی قوت بھی بڑھی ہے۔ یہ کم از

کم عبادت ہے۔

ہم نے گفتگو کی ابتدا میں ایک آیت پڑھی تھی۔ آپ کی خدمت میں اس آیت کا ترجمہ پیش کرتے ہیں' جس کا مفہوم یہی ہے۔ قرآنِ مجید' نہج البلاغہ' امام جعفر صادق علیہ السلام' امام زین العابدین علیہ السلام جو بھی باتیں مختلف الفاظ اور مختلف زبانوں میں کہیں' جب آپ ان پر نگاہ ڈالتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی حقیقت تک پہنچے ہوئے ہیں' اور ایک ہی حقیقت کا ذکر کرتے ہیں۔ ہم آیاتِ قرآنی میں سے دو آیات میں اس طرح پڑھتے ہیں۔ یعنی دو مقامات پر یہ آیت آئی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ. (۱) اے اہلِ ایمان! نماز اور صبر (جس کی تفسیر روزہ کی گئی ہے) سے مدد لو۔ یہ انتہائی عجیب تعبیر ہے! ہم سے کہتے ہیں کہ نماز سے مدد مانگو' روزے سے مدد مانگو۔ یعنی تم نہیں جانتے کہ یہ نماز قوت کا کیسا سرچشمہ ہے! یہ روزہ طاقت کا کیسا منبع ہے! اگر تمہیں نماز پڑھنے کے لئے کہا گیا ہے' تو قوت و طاقت کے ایک سرچشمے کی جانب تمہاری رہنمائی کی گئی ہے' اور اگر روزہ رکھنے کو کہا گیا ہے' تو طاقت کے ایک سرچشمے کی طرف تمہاری رہنمائی کی گئی ہے۔ تم اپنے نفس اور روح پر مسلط ہونے کے لئے نماز پڑھو' روزہ رکھو۔ "اَلْعُبُودِيَّةُ جَوْهَرَةٌ كُنْهُهَا الرُّبُوبِيَّةُ."

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۵۳

اب کیا اِس ربوبیت اور تسلط کا خاتمہ یہیں پر ہو جاتا ہے؟ نہیں۔ اسکے درجات اور مراتب ہیں۔ آپ عبادت کے راستے پر جس درجے بھی آگے بڑھیں گے' ربوبیت حاصل کریں گے اور اصطلاحاً ولایت حاصل کریں گے۔ یعنی تسلط حاصل کریں گے۔ اِس درجے سے جس کے بارے میں ہم نے عرض کیا ایک درجے بالاتر {جا پہنچیں گے}' وہاں پہنچ جائیں گے کہ آپ اپنے نفس کے خیالات کے مالک بن جائیں گے۔

بالاتر درجات

کیا اس سے بھی بالاتر کوئی درجہ ہے؟ ہاں' انسان (کم از کم اپنے بارے میں) مستجاب الدعوۃ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ عبودیت کے نتیجے میں اپنے بدن پر اثر انداز ہو سکتا ہے' معجزہ کر سکتا ہے' کرامت کر سکتا ہے' (اَلْعُبُودِیَّةُ جَوْهَرَةٌ کُنْهُهَا الرُّبُوبِیَّةُ) اس کا نتیجہ تسلط ہے۔

کیا اِس سے بڑھ کر بھی ہے؟

جی ہاں' لیکن یہ بڑھ کر اور بالاتر درجہ ہمارے فہم اور ہماری فکر کے لئے بہت زیادہ ہے۔ بہت سے افراد یہ باور نہیں کر سکتے کہ کوئی انسان عبودیت کے اثر سے' خدا کی بندگی اور تذلل کے اثر سے' صراطِ عبودیت کو طے کرنے کی وجہ سے' اس مقام پر جا پہنچتا ہے کہ کائنات میں بھی تصرف کر سکتا ہے۔ یعنی ایک بیمار کا روحی راستے سے علاج کر سکتا ہے' ایک پیدائشی اندھے کو شفا دے سکتا ہے'

ایک مبروص (leper) کو شفا دے سکتا ہے (جیسا کہ قرآنِ کریم حضرت عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں بیان کرتا ہے) البتہ اذنِ الٰہی سے۔ خدا نے انہیں یہ قدرت دی ہوئی ہے۔ اذنِ خدا وہی قدرت ہے جو خدا عطا کرتا ہے: وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی بِاِذْنِیْ. (۱) یا ایک دوسری آیت میں: وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲) یہ ایک بلند تر درجہ ہے جس کے بارے میں ہم فی الحال گفتگو کرنا نہیں چاہتے' بعد کی نشست میں انشاء اللہ آپ کی خدمت میں "قرب" کے بارے میں کچھ نکات عرض کریں گے۔ یہ جو ہم عبادت میں کہتے ہیں کہ "قربةً اِلَی اللّٰه" اس کے کیا معنی ہیں؟ تقربِ خدا سے کیا مراد ہے؟ اس بات کی انشاء اللہ آپ کی خدمت میں وضاحت کریں گے۔

حضرت علی علیہ السلام اُن بندوں اور عابدوں میں سے ہیں جو اِس خداوندگاری پر پہنچے ہوئے ہیں۔ البتہ غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے' آپ یہ تصور نہ کیجئے گا کہ یہ عبودیت جس کا نتیجہ خداوندگاری اور تسلط ہے اس کا نتیجہ خود پسندی بھی ہے۔ ہرگز نہیں' خود پسندی کا عبودیت کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں۔ کیا اس کا نتیجہ غرور اور انانیت ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

۱۔ اور تم پیدائشی اندھوں کو اور برص میں مبتلا لوگوں کو ہماری اجازت سے صحیتیاب کردیتے تھے اور ہماری اجازت سے مردوں کو زندہ کردیا کرتے تھے۔ (سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۱۱۰)

۲۔ اور حکم خدا سے مردوں کو زندہ کروں گا۔ (سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۴۹)

وہ بندہ جو ربوبیت کے لئے بندگی کرتا ہے' اسے اپنے عمل کا کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ عبودیت تذلل اور خاکساری کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اپنی مناجات میں عرض کرتے ہیں: خدایا! کَفٰی لی فَخراً اَنْ اکونَ لَکَ عَبْداً وَکَفٰی لی عِزّاً اَنْ تکونَ لی رَبّاً. بارالٰہا! میرے لئے یہ افتخار کافی ہے کہ میں تیرا بندہ رہوں اور میرے لئے یہ عز و شرف بہت ہے کہ تو میرا رب' خداوندگار اور پروردگار ہے۔

ہم حضرت علی علیہ السلام کے لئے بہت سے مقامات اور درجات کے قائل ہیں' اور قائل ہونا بھی چاہئے۔ دراصل مسئلۂ ولایت' جس کے حوالے سے کہتے ہیں کہ بغیر ولایتِ تکوینی کے (ان حدود میں جس کے بارے میں شاید ایک نشست میں آپ کی خدمت میں عرض کریں) دراصل ولایت ہی نہیں ہوتی۔ {وہ لوگ} غلط فہمی کا شکار ہیں' انہوں نے سمجھا نہیں ہے' علم نہیں رکھتے' وہ لوگ جو ولایت تکوینی کے منکر ہو گئے ہیں اور حتیٰ ولایتِ تکوینی کو نہیں سمجھے ہیں کہ وہ کیا ہے۔ انہوں نے ایک اور چیز کو جاہلانہ طور پر فرض اور تصور کر لیا ہے اور اسی کو بار بار لوگوں سے کہا ہے' انہوں نے اسے اپنی کتابوں میں بھی لکھا ہے۔ کیونکہ ان کا ذہن ان مسائل تک نہیں پہنچتا۔ یہ لوگ بنیادی طور پر انسان اور خدا کو نہیں پہچانتے۔ اس قسم کے مسائل کے بارے میں اظہارِ رائے کرنا' دو مسئلوں کی فرع ہے: اوّل خدا کی شناخت' دوّم: انسان کی شناخت اور

انسان کی اندرونی صلاحیتوں کی شناخت' اور خدا سے انسان کے تقرب کے معنی اور عبودیت اور عبادت کے معنی۔

حضرت علی علیہ السلام جنہیں اس قدر محبوبیت حاصل ہے' یہ ان کی عبودیت کی وجہ سے ہے۔ کیا خوب کہتے ہیں ابوسعید ابی الخیر (یا خواجہ عبداللہ انصاری)

آن کس کہ تو را شناخت جان را چہ کند — فرزند و عیال و خانمان را چہ کند

دیوانہ کنی (۱) ھر دو جہانش بخشی (۲) — دیوانۂ تو ھر دو جہان را چہ کند

ایسا شخص جو تیرا مجذوب ہو جاتا ہے' اُسے ان ربوبیتوں کی کیا پروا جو انانیت' غرور اور تکبر پیدا کرتی ہیں۔

یہ ایام' ایک طرف تو احیا کے دن اور راتیں ہیں' دعا کے دن اور راتیں ہیں' عبودیت اور بندگی کرنے کے دن اور راتیں ہیں۔ اور دوسری طرف مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے ایام ہیں۔ اس ہستی کی شہادت کے ایام ہیں جو عظیم ترین بندگانِ خدا میں سے ایک ہے۔ پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہم ایسی بندگی رکھنے والے کسی اور بندے سے واقف نہیں ہیں۔

۱۔ یعنی اسے اپنا شیفتہ اور مجذوب کر لیتا ہے۔

۲۔ اسی ربوبیت کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ (اَلْعُبُودِیَّۃُ جَوْھَرَۃٌ کُنْھُھَا الرُّبُوبِیَّۃُ)

حضرت علی علیہ السلام کے ضرب لگنے سے شہادت تک تخمینہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً پینتالیس گھنٹے ہوں گے۔ یعنی اس لمحے تک جب کہ آپ کی روح نے عالمِ ملکوت کی جانب پرواز کی۔ اور ہمارے خیال میں پینتالیس گھنٹے کی یہ مدت حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے حیرت انگیز ترین ادوار میں سے ہے۔ ان پینتالیس گھنٹے میں انسان حضرت علی کی شخصیت کو دیکھتا ہے' ان پینتالیس گھنٹوں میں علی کا یقین اور ایمان دوسروں پر نمایاں ہوتا ہے۔ خود اُن کی نظر میں یہ ایسے لحظات اور ساعتیں ہیں کہ جس میں انہوں نے اپنا انعام حاصل کیا ہے۔ مقابلے کو انتہا تک پہنچایا ہے' انتہائی افتخار کے ساتھ اپنے پروردگار کے پاس جانا چاہتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام ایک دوسری ہی شئے ہیں۔ نہج البلاغہ میں ہے' فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ لَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ (۱) تو میں سمجھ گیا کہ امتِ اسلامیہ میں فتنے پیدا ہوں گے۔ مجھے شہادت کی بڑی تمنا تھی' میری آرزو تھی کہ احد میں

۱۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف اس بات پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ وہ یہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور اُن کا امتحان نہیں ہوگا۔ بے شک ہم نے اُن سے پہلے والوں کا بھی امتحان لیا ہے اور اللہ تو بہرحال یہ جاننا چاہتا ہے کہ ان میں کون لوگ سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں۔ (سورۂ عنکبوت ۲۹۔ آیت ۲ اور ۳)

شہید ہو جاؤں۔۔ مسلمانوں کے ستر افراد شہید ہو گئے۔ جب میں شہید نہ ہوا تو میں انتہائی دل گرفتہ تھا' میں رنجیدہ ہو گیا (یہ باتیں ایک جوان کر رہا ہے۔ جنگِ احد کے زمانے میں حضرت علی علیہ السلام ایک تقریباً پچیس برس کے مرد تھے' ان کے دو چھوٹے بچے تھے' امام حسن اور امام حسین' صدیقہ طاہرہ جیسی ان کی زوجہ تھیں' اسکے باوجود شہادت کی آرزو نے علی کو اس قدر بے تاب کر رکھا تھا کہ جب آپ شہید نہ ہوئے تو رنجیدہ تھے) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے ہی ان سے وعدہ کیا ہوا تھا۔ شاید خود انہوں نے ہی رسولِ کریم سے سوال کیا تھا کہ اے اللہ کے رسول! میں کس انداز سے دنیا سے رخصت ہوں گا؟ پیغمبر نے فرمایا تھا کہ تم ایک شہید کی صورت میں دنیا سے جاؤ گے۔ لیکن جب آپ نے دیکھا کہ آپ جنگِ احد میں شہید نہیں ہوئے' تو آپ رنجیدہ ہو گئے۔ رسولِ کریم کی خدمت میں تشریف لے گئے اور کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ خدا شہادت کو میرا مقدر بنائے گا۔ پس آخر کیوں میں احد میں شہید نہیں ہوا؟ آنحضرت نے فرمایا: علی جان' زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا' آپ یقیناً اس امت کے شہید ہوں گے۔ اسکے بعد پیغمبر نے علی سے ایک سوال کیا: علی جان' بتاؤ جب تم بسترِ شہادت پر ہو گے تو کس طرح صبر کرو گے؟ آپ کیسا شاندار جواب دیتے ہیں {فرماتے ہیں}: اے اللہ کے رسول! وہ تو صبر کی جگہ نہیں' وہ تو خوشی کی جگہ ہے' شکر اور سپاس گزاری

کا مقام ہے۔ آپ مجھے بتایئے کہ جب میں بستر شہادت پر ہوں تو کس طرح خدا کا شکر ادا کروں؟!

علی ہمیشہ اپنے اس گم گشتہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ اجمالاً آپ جانتے تھے کہ آپ کا یہ سر راہِ خدا میں ضرب کھائے گا۔ آپ کہا کرتے تھے کہ خدایا! وہ پیارا لمحہ وہ خوبصورت لحظہ وہ پرلذت اور شادمانی بھری ساعت کب آئے گی؟ رسولِ مقبول نے حضرت علی سے فرمایا تھا کہ آپ کی شہادت ماہِ رمضان میں واقع ہوگی اور اِس اکتالیس ہجری کے ماہِ رمضان میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ علی کے دل کو پتا چل گیا تھا کہ اس ماہِ مبارک میں اس کی تمنا پوری ہو جائے گا۔ علی کے بچوں کو محسوس ہو گیا تھا کہ اُن کے بابا اس ماہِ رمضان میں ایک انتظار اضطراب اور بے چینی کا شکار ہیں۔ ایسے جیسے کسی بڑی بات کا انتظار کر رہے ہیں۔

رمضان کی تیرہویں تاریخ ہے آپ لوگوں کے سامنے خطبہ ارشاد فرماتے ہیں اُن سے خطاب فرماتے ہیں خطبے کے درمیان آپ کی نگاہ امام حسن پر پڑتی ہے اپنی گفتگو روک دیتے ہیں، آواز دیتے ہیں حسن! بتاؤ اس مہینے کے کتنے دن گزر گئے ہیں؟ ایک انتہائی عجیب سوال ہے۔ علی خود ہر ایک سے بہتر جانتے ہیں کہ کتنے روز گزر چکے ہیں۔ کیوں اپنے اس جوان سے دریافت کر رہے ہیں؟ حسن عرض کرتے ہیں: بابا جان! تیرہ دن گزر چکے

ہیں۔ آپ فوراً امام حسین کی طرف رخ کرتے ہیں: بیٹا حسین! اس مہینے کے کتنے دن باقی بچے ہیں؟ (بالکل واضح ہے کہ جب تیرہ دن گزر چکے ہیں تو سترہ دن باقی رہے ہیں) بابا! سترہ روز باقی رہ گئے ہیں۔ {یہ سن کر} آپ اپنی ریشِ مبارک پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور فرماتے ہیں: اس داڑھی کا اس سر کے خون سے رنگا جانا بہت قریب ہے۔ آپ کو اس ساعت اور اس دن کا انتظار تھا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ان پینتالیس گھنٹوں کے دوران جو خوبصورت جملے ارشاد فرمائے ان میں سے ایک یہ ہے۔ دوسرے لوگ انتہائی مضطرب اور رنجیدہ تھے۔ آنسو بہا رہے تھے' رو پیٹ رہے تھے' لیکن خود علی' بشاشت کا اظہار کر رہے تھے۔ فرمایا: واللهِ مافَجَأَنی مِنَ الْمَوْتِ وارِدٌ كَرِهْتُهُ وَلا طالِعٌ اَنْكَرْتُهُ وماكُنْتُ اِلاّ كَقارِبٍ وَرَدَ وَطالِبٍ وَجَدَ" خدا کی قسم اگر میں مر گیا تو مجھے کوئی کراہت نہیں ہوگی' ذرہ برابر کراہت نہیں۔ یہ میرے لئے ایک انجانی بات نہیں تھی' ایک انجانا مہمان نہ تھا' ایک جانا پہچانا مہمان تھا۔ اسکے بعد فرمایا: تم جانتے ہو کہ میری مثال کیسی مثال ہے؟ اُس عاشق کی سی مثال ہے جو اپنے مطلوب اور معشوق کا پیچھا کرتا ہے' اور اُسے پا لیتا ہے۔ میری مثال اس پیاسے کی سی مثال ہے جو ایک تاریک رات میں پانی کی تلاش میں ہوتا ہے اور اچانک پانی دریافت کر لیتا ہے' وہ کس قدر خوش ہوتا ہے!

آپ کے اصحاب آتے ہیں' {کہتے ہیں} بے شک اے امیر المومنین!

آپ کے لئے ایسا ہی ہے۔ لیکن آپ کے بعد ہم کیا کریں گے؟ انیسویں کی شب' حضرت علی کے بچوں کو محسوس ہو گیا تھا کہ آج ایک اور ہی طرح کی رات ہے' کیونکہ اس رات حضرت کی ایک خاص وضع تھی۔ کبھی آپ باہر تشریف لاتے' آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے اور واپس پلٹ جاتے۔ اس رات بھی علی صبح تک نہ سوئے۔ آپ کے بچے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ امیر المومنین کے یہاں نماز پڑھنے کی ایک مخصوص جگہ تھی۔ یعنی گھر میں ایک کمرہ تھا جہاں نماز پڑھا کرتے اور عبادت کیا کرتے تھے۔ حسن ابن علی علیہما السلام جو اپنے گھر چلے گئے تھے' صبح طلوع ہونے سے پہلے اپنے گھر سے لوٹ آئے' اپنے پدر بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوئے' ان کے نماز پڑھنے کی جگہ گئے' دیکھا کہ علی بیٹھے ہوئے عبادت میں مشغول ہیں۔ اس موقع پر آپ نے وہ قصہ جو اس رات واقع ہوا تھا اپنے فرزند حسن سے بیان کیا۔ فرمایا: بیٹا! کل رات میں اسی طرح بیٹھا ہوا تھا (یعنی میں کل رات نہیں سویا تھا' بستر نہیں بچھایا تھا) کہ میری آنکھ لگ گئی۔ ایک لحہ میں' ایک عجیب سرعت کے ساتھ' اسی خواب کے عالم میں' میں نے تمہارے نانا پیغمبر اکرم کو دیکھا "مَلَكَتنی عینی وَاَنا جالِسٌ فَسَنَحَ لی رَسولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ" "میری آنکھ لگ گئی' مجھ پر نیند کا غلبہ ہو گیا' میں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے ایک لمحے کے لئے پیغمبر کو دیکھا۔ جوں ہی پیغمبر پر میری نگاہ پڑی میں نے اُن کی خدمت میں امت کی

شکایت کی، میں نے عرض کیا: یا رسولَ اللہِ ماذا لَقیتُ مِن اُمّتِکَ مِنَ الَاوَدِ وَاللَّدَدِ. اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کی امت کے ہاتھوں کیا کیا ستم سہے ہیں، اور اس امت نے میرا کیسا کیسا دل دکھایا ہے! اے اللہ کے رسول! میں آپ سے اپنے دشمنوں کی۔۔۔(۱)

✿✿✿

۱۔ آخری چند سیکنڈ کی تقریر ریکارڈ نہیں ہوئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عبادت و نماز

(۲)

گزشتہ نشست میں ہم نے عبودیت، حق کی بندگی، حق کی پرستش اور ان آثار کے بارے میں کچھ گفتگو کی تھی جو عبودیت سے انسان کے لئے مرتب ہوتے ہیں، اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی وہ حدیث جو "مصباح الشریعہ" میں نقل ہوئی ہے، اُسے پیش کیا تھا۔ حدیث یہ تھی: "اَلْعُبُودِیَّةُ جَوْهَرَةٌ کُنْهُهَا الرُّبُوبِیَّةُ." نیز اس حدیث کے بارے میں کچھ وضاحتیں عرض کی تھیں۔ لیکن گزشتہ وضاحتوں کے بارے میں مزید گفتگو کی ضرورت ہے۔ ساتھ ساتھ ہم ان نکات کے بارے میں بھی کچھ عرائض آپ کی خدمت میں پیش کریں گے جن کے حوالے سے ہم نے اِس نشست میں گفتگو کا وعدہ کیا تھا، یعنی مسئلہ "تقربِ الٰہی" جو عبادت کی روح ہے۔ پہلے ہم آپ کی خدمت میں تقرب کا مسئلہ عرض کرتے ہیں۔

آپ جب کبھی کوئی عبادت انجام دینا چاہتے ہیں، مثلاً نماز پڑھتے

ہیں، روزہ رکھتے ہیں، حج انجام دیتے ہیں، یا زکات دیتے ہیں، تو نیت کرتے ہیں اور نیت میں کہتے ہیں کہ: نماز پڑھتا ہوں قُربَۃً اِلَی اللہِ. یعنی نماز پڑھتا ہوں تاکہ خدائے تبارک وتعالیٰ کے نزدیک ہو جاؤں۔ روزہ رکھتا ہوں قُربَۃً اِلَی اللہِ، اس لئے کہ خدا سے نزدیک ہو جاؤں، حج کرتا ہوں قُربَۃً اِلَی اللہِ، اس لئے کہ خدا کا قرب حاصل کرلوں، احسان کرتا ہوں، دوسرے انسانوں کے کام آتا ہوں، تاکہ خدا کا قرب میسر آئے۔

ہم اس نشست میں، آپ کی خدمت میں، خدا سے نزدیک ہونے کے معنی کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔ {یہ واضح کرنا چاہتے ہیں} کہ بنیادی طور پر خدا سے نزدیک ہونا کوئی معنی ومفہوم رکھتا بھی ہے یا نہیں۔ بالفاظِ دیگر خدا سے نزدیک ہونا کیا ایک حقیقی نزدیکی ہے، واقعاً انسان ایک وسیلے سے، عبادت و اطاعت کے وسیلے سے (وہ عبادت واطاعت جس شکل کی بھی ہوا کرے) خدا سے نزدیک ہوتا ہے، یا خدا سے واقعی نزدیک ہونے کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ خدا سے نزدیک ہوتے ہیں، یہ ایک تعبیر ہے، ایک مجازی مفہوم ہے۔

کس طرح؟

ہم آپ کی خدمت میں دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ایک اُس مقام کی جس میں ایک شئے کی دوسری شئے سے نزدیکی حقیقی ہے اور ایک اُس مقام کی

جہاں ایک شئے کا دوسری شئے سے نزدیک ہونا ایک مجازی تعبیر ہے' حقیقی اور واقعی نہیں۔

حقیقی طور پر نزدیک ہونا

جہاں نزدیک ہونے سے ہماری تعبیر حقیقی {طور پر نزدیک ہونا} ہے {وہ یہ ہے کہ} آپ یہاں {تہران} سے قم جانا چاہتے ہیں' آپ جس قدر چلتے چلے جائیں گے اس قدر کہیں گے کہ میں قم سے قریب ہو رہا ہوں اور تہران سے دور۔ بچ بچ یہاں قم سے آپ کا قریب ہونا ایک معنی اور مفہوم رکھتا ہے۔ یعنی آپ جو تہران میں ہیں' آپ کے اور شہر قم کے درمیان ایک حقیقی فاصلہ موجود ہے' اور آپ {سفر کے ذریعے} تدریجاً اس فاصلے کو کم کر رہے ہیں۔ لہٰذا آپ کہتے ہیں کہ میں قم شہر سے نزدیک ہو رہا ہوں۔ یہ نزدیک ہونے کے ایک معنی ہیں۔ حقیقتاً آپ تہران سے چل کر قم کی طرف جا رہے ہیں' آپ کے اور قم کے درمیان ایک فاصلہ ہے' اور تدریجاً یہ فاصلہ کم ہوتا جاتا ہے' یہاں تک کہ آپ قم پہنچ جاتے ہیں۔ آپ اس قدر نزدیک ہو جاتے ہیں کہ پھر ''نزدیکی'' کا لفظ بھی تقریباً بے معنی ہو جاتا ہے۔ یعنی آپ قم پہنچ گئے ہیں اور واصلِ قم ہو گئے ہیں۔

یہ نزدیک ہونا' حقیقی طور پر نزدیک ہونا ہے۔

مجازی طور پر نزدیک ہونا

ہم ایک اور طرح کے نزدیک ہونے سے بھی واقف ہیں' جو فقط تعبیر ہے'

حقیقی طور پر نزدیک ہونا نہیں ہے۔

وہ کس طرح؟

آپ ایک عہدے و منصب کے حامل شخص' یا کسی دولت مند شخص کو پیش نظر رکھئے' جس کے پاس بہت زیادہ طاقت اور بہت زیادہ مال و دولت ہے۔ پھر ہم بعض افراد کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ فلاں عہدیدار سے نزدیک ہے' فلاں شخص فلاں عہدیدار سے نزدیک ہے۔ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ فلاں قدرت مند شخص سے نزدیک ہیں' یا نزدیک نہیں ہیں؟ مثلاً آپ کہتے ہیں نہیں' میں (اُس سے) نزدیک نہیں ہوں۔ لیکن فلاں شخص اُس سے بہت نزدیک ہے۔

کیسے؟

مجھے کسی قدرت مند اور منصب و مقام کے حامل شخص سے کوئی کام پڑتا ہے' میں چاہتا ہوں کہ ایک ایسے شخص کے پاس جاؤں جو اس سے نزدیک ہو' وہ میرا اس سے تعارف کرائے اور میری مشکل حل ہو جائے۔

یہ نزدیک ہونا کس قسم کا نزدیک ہونا ہے؟

اگر آپ کہتے ہیں کہ ایاز' سطان محمود سے نزدیک تھا' تو اس نزدیک ہونے سے کیا مراد ہے؟ آپ کو ہر قدرت مند شخص کے حوالے سے اس قسم کی چیز نظر آئے گی۔ مثلاً کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم سے نزدیک تھے۔ کیا اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیشہ پیغمبر اور علی کے درمیان کم مکانی فاصلہ رہا کرتا تھا؟ یعنی اگر اس کا حساب کیا جاتا' تو ہمیشہ دوسرے افراد پیغمبر سے ایک فاصلے پر ہوتے تھے اور وہ شخصیت جس کے جسم کا فاصلہ پیغمبر کے جسم سے سب سے زیادہ کم تھا وہ علی تھے؟

جب آپ کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں عہدیدار سے قریب ہے؟ تو کیا آپ کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اُس کا مکانی فاصلہ کم ہے؟ نہیں' یہ مراد نہیں ہوتی۔ اگر اس طرح ہو' تو اس عہدیدار کے دروازے پر رہنے والا چپراسی' تمام دوسرے لوگوں سے زیادہ اس سے نزدیک ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اس سے صرف تین چار میٹر کے فاصلے پر رہتا ہے اور اسکی خدمت کے لئے تیار رہتا ہے۔ کوئی بھی اور قدرت مند شخص اس عہدیدار کے چپراسی سے زیادہ اس سے نزدیک نہیں۔ حالانکہ آپ کی مراد یہ نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ چپراسی ان معنی میں جو آپ کہہ رہے ہیں' اس شخص سے نزدیک نہیں ہے {بلکہ} سرے سے نزدیک ہی نہیں ہے۔

پس پھر آپ کس معنی میں کہتے ہیں کہ اسکے نزدیک قریب اور مقرب ہے؟

آپ کی مراد یہ ہے کہ اسکے دل میں' اسکے ذہن میں اس انسان کو ایسی محبوبیت اور ایسا احترام حاصل ہے کہ وہ اسکی بات نہیں ٹالتا' اسکی خواہش رد نہیں

کرتا' اسکی خواہش اسکے لئے ایسے ہی ہے جیسے خود اسکی اپنی خواہش ہو۔ یہ قرب' قربِ معنوی ہے۔ لیکن جب ہم قربِ معنوی بھی کہتے ہیں' تو درحقیقت تعبیر ہے' قربِ مجازی ہے۔ یعنی خود یہ خود اُس سے' یہ شخص اُس شخص سے نزدیک نہیں ہے' بلکہ یہ فقط اس انسان کے ذہن اور روح میں ایک خاص محبوبیت رکھتا ہے' اسکے لطف وعنایت کا مورد ہے' اس وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ نزدیک ہے۔

ایک بندے کے خدا سے نزدیک ہونے کے کیا معنی ہیں؟

یقینی طور پر پہلے معنی والی نزدیکی مراد نہیں ہے۔

یعنی جب ہم کہتے ہیں کہ بندہ عبادت کی وجہ سے خدا سے نزدیک ہو جاتا ہے' تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ اس بندے کا خدا سے فاصلہ کم ہو جاتا ہے۔ یعنی پہلے اسکے اور خدا کے درمیان فاصلہ موجود تھا' اب تدریجاً وہ اس سے نزدیک اور نزدیک ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ فاصلہ کم ہوتا جاتا ہے اور وہ مرحلہ (آ پہنچتا ہے) جس کے متعلق قرآنِ مجید کہتا ہے کہ: یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡهِ (۱) جس کا نام پروردگارِ عالم سے ملاقات اور لقائے رب ہے۔ دو جسموں کی مانند جو ایک دوسرے کے نزدیک آجاتے ہیں۔ مثلاً جس طرح آپ قم پہنچ جاتے ہیں' ویسے ہی بندہ خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ اس قسم کے معنی نہیں ہیں اور یقیناً مراد یہ نہیں ہے۔

کیوں؟

اس لئے کہ ان دسیوں عقلی دلائل سے قطع نظر جو یہاں موجود ہیں کہ خدا اپنے بندوں سے فاصلے پر نہیں ہے' خدا کا کوئی مکان نہیں ہے' جس کی بنا پر اس قسم کا فاصلہ فرض ہو سکے' قرآن اور اسلام کی منطق کے لحاظ سے بھی' یعنی نقلی منطق کے لحاظ سے بھی' جس نے ہمیں خدا سے قرب اور نزدیکی کا حکم دیا ہے' جس نے ہمیں زُلفای عند اللہ کا حکم دیا ہے' وہی جس نے ہم سے کہا ہے کہ خدا کا قرب حاصل کرو۔ کوئی خدا سے دور ہوتا ہے اور کوئی خدا سے نزدیک ہے۔ وہی منطق کہتی ہے کہ خدا تمام موجودات سے نزدیک ہے' خدا کسی موجود سے دور نہیں: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۲) ہم انسان کی رگ گردن سے بھی زیادہ اسکے قریب ہیں۔ دوسری آیت: وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (۳) تم جہاں کہیں ہو' خدا تمہارے ساتھ ہے۔ خدا کسی موجود سے دور نہیں ہے۔

پس ان معنی میں فاصلے کو کم کرنے کا کوئی مفہوم نہیں پایا جاتا۔ ہاں' ایک نکتہ ہے جسے ہم بعد میں عرض کریں گے۔ خدا تمام لوگوں سے مساوی طور پر نزدیک ہے۔ بلکہ تمام اشیا سے یکساں طور پر نزدیک ہے۔ لیکن اشیا مساوی

۱۔ اے انسان! تو اپنے رب کی طرف جانے کی کوشش کر رہا ہے' تو ایک دن اس کا سامنا کرے گا۔ (سورۂ انشقاق ۸۴۔ آیت ۶)

۲۔ اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ اس کا نفس کیا کیا وسوسے پیدا کرتا ہے اور ہم اس سے رگ گردن سے زیادہ قریب ہیں۔ (سورۂ ق ۵۰۔ آیت ۱۶)

۳۔ اور وہ تمہارے ساتھ ہے' تم جہاں بھی ہو۔ (سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۴)

طور پر خدا سے نزدیک نہیں ہیں۔ بعض اشیا خدا سے دور ہوتی ہیں لیکن خدا تمام اشیا سے نزدیک ہے' اور اس میں بھی ایک راز پوشیدہ ہے' جسے شاید آپ کے لئے عرض کرسکوں۔ بہرحال' ان معنی میں نہیں ہے کہ دو چیزوں کے درمیان فاصلہ ہو اور ہم عبادت کے ذریعے اِن دو چیزوں کا فاصلہ کم کریں۔

پس کیا دوسرے معنی مراد ہیں؟

یعنی کیا خدا وندِ عالم کا قرب' معاشرتی عہدے ومقام کی حامل ہستیوں سے تقرب کی مانند ہے؟ بالالفاظ دیگر خدا سے تقرب ایک ایسی تعبیر ہے جسے ہم استعمال کرتے ہیں؟ ایک مجاز ہے جسے ہم استعمال کرتے ہیں؟ اسی طرح جیسے ہم نے اپنی اجتماعی گفتگو میں اس قسم کی باتوں کو قرار دیا ہوا ہے۔ ایک مطلب جو واقعی نزدیک ہونا نہیں ہے {بلکہ ہم نے} توجہ کا مورد ہونے کو' عنایت کا مورد ہونے کو' لطف کا مورد ہونے کو قرب اور تقرب کا نام دیا ہوا ہے۔ بہت سے افراد حتیٰ بہت سے علما اس طرح تصور کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پروردگار سے تقرب کے یہی معنی ہیں جو نتیجے میں تعبیر اور مجاز ہے۔

اگر ہم کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ خدا سے نزدیک ہیں۔ یعنی دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ خدا کے نزدیک مقرب ہیں۔ یعنی ان پر خدا کا سب سے زیادہ لطف اور عنایت ہے۔ بلاتشبیہ {عرض ہے} 'ہم خدا سے تشبیہ دینا نہیں چاہتے۔ ممکن ہے آپ کے ایک

سے زیادہ بچے ہوں' اور ان بچوں میں سے ایک بچہ آپ کے ذوق' مزاج اور آئیڈیل کے زیادہ مطابق ہو۔ آپ کہتے ہیں کہ اپنے بچوں میں سے یہ بچہ دوسرے بچوں کی نسبت میرے سب سے زیادہ قریب ہے۔ یعنی ان سب سے زیادہ میری توجہ کا مرکز ہے۔ اگرچہ آپ کے تمام بچے' جسمانی اعتبار سے آپ سے مساوی طور پر نزدیک ہیں' سب کے سب ایک ہی گھر میں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ بچہ جسے آپ کم پسند کرتے ہیں وہ آپ کے نزدیک بیٹھ جاتا ہے اور وہ بچہ جسے آپ زیادہ پسند کرتے ہیں وہ آپ سے دو میٹر فاصلے پر بیٹھتا ہے۔

کہتے ہیں کہ پروردگار کے مقرب ہونے کے معنی اسکے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ ہم زیادہ پروردگار کی عنایت کے مرکز ہوں۔ وگرنہ یہ بے معنی بات ہے کہ ہم نزدیک ہوں اور خدا کی طرف چلیں۔ اسی طرح یہ بات بھی بے معنی ہے کہ خدا ہماری طرف آئے اور خدا ہم سے نزدیک ہو جائے۔ ہمارے واقعاً خدا سے نزدیک ہونے کا بھی کوئی مفہوم نہیں۔ خدا تو ہر چیز سے نزدیک ہے۔ ہم خدا سے نزدیک ہو جائیں' یعنی کیا؟

قربِ الٰہی کے معنی

لیکن وہ علما جو گہری نظر رکھتے ہیں اور زیادہ معرفت کے حامل ہیں' وہ کہتے ہیں کہ نہیں' بات اس طرح نہیں ہے۔ خدا سے نزدیک ہونا' حقیقی طور پر

نزدیک ہونا ہے، مجازی اور تعبیری طور پر نزدیک ہونا نہیں۔ انسان واقعاً خدا سے نزدیک تر ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ تصور نہ کیجئے گا کہ اس نزدیک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی فاصلے کو کم کرتے ہیں۔ فاصلے کی بات نہیں ہے۔

پس پھر کیا بات ہے؟

کہتے ہیں کہ خداوندِ تبارک وتعالیٰ کمالِ مطلق ہے، وجودِ بے حد ہے، ہستی کا لا متناہی مرکز ہے، وہ علمِ محض ہے، عین علم ہے۔ {مشہور فلسفی عالم} میر داماد کے الفاظ میں: عِلْمٌ کُلُّهُ وَ کُلُّهُ الْعِلْمُ، قُدْرَةٌ کُلُّهُ وَ کُلُّهُ الْقُدْرَةُ، حیاةٌ کُلُّهُ وَ کُلُّهُ الْحَیاةُ، اِرادَةٌ کُلُّهُ وَ کُلُّهُ الْاِرادَةُ، وہ کمالِ مطلق ہے۔ موجودات جوں جوں اپنے وجود کے واقعی کمالات حاصل کرتے جاتے ہیں اسی قدر ہستی کے مرکز، محور اور حقیقت سے واقعاً نزدیک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نزدیک ہونا واقعی نزدیک ہونا ہے، جسمانی نزدیکی نہیں لیکن واقعی اور حقیقی نزدیکی ہے، مجاز اور تعبیر نہیں ہے۔ {یہ تقرب} ایک انسان کے کسی معاشرتی مقام کے حامل شخص کے مقرب ہو جانے یا ایک بچے کے اپنے باپ کے مقرب ہونے کی قسم سے نہیں ہے، جو اس معنی میں ہے کہ اسکے لطف کے آثار زیادہ ہیں۔ نہیں، واقعاً پیغمبر ہماری نسبت خدا سے زیادہ نزدیک ہیں، حقیقتاً امیر المومنین ہماری نسبت خدا سے زیادہ نزدیک ہیں، اور یہ قرب واقعی قرب ہے۔ نتیجے میں جہاں ہم عبادت کرتے ہیں، عبودیت انجام دیتے ہیں، اگر واقعاً

ہماری عبودیت عبودیت ہو تو ہم قدم بقدم خدا کی طرف (حرکت کرتے ہیں)
یہاں جو ہم ''قدم'' کہہ رہے ہیں تو یہ بھی ایک تعبیر ہے کیونکہ اس مقام پر یہ
کلمات درست نہیں ہیں ہم ''سیر'' کہتے ہیں۔ کیونکہ علی ابن الحسین علیہما السلام
جیسے اشخاص نے یہی تعبیر کی ہے لہٰذا ہم بھی تعبیر کر رہے ہیں۔ امام علی ابن
الحسین فرماتے ہیں: اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَجِدُ سُبُلَ الْمَطالِبِ اِلَیْکَ مُشْرَعَةً وَ
مَناهِلَ الرَّجاءِ لَدَیْکَ مُتْرَعَةً وَاَعْلَمُ اَنَّکَ لِلرّاجینَ بِمَوْضِعِ
اِجابَةٍ وَلِلْمَلْهوفینَ بِمَرْصَدِ اِغاثَةٍ. یہاں تک کہ فرماتے ہیں: وَاَنَّ
الرّاحِلَ اِلَیْکَ قَریبُ الْمَسافَةِ. بارالہا! جو مسافر تیری طرف حرکت اور
کوچ کرتا ہے اُس کا فاصلہ نزدیک ہے اسے بہت دور کا راستہ طے نہیں
کرنا ہوتا اُسکی مسافت نزدیک ہے۔

دنیائے تشیع میں عظیم خزانے موجود ہیں ان میں سے ایک یہ دعائیں
ہیں خدا کی قسم یہ معرفت کے خزانے ہیں اگر ہم اپنے پاس موجود ان دعاؤں
کے سوا کوئی اور دلیل نہ بھی رکھتے ہوں علی ابن ابیطالب علیہ السلام کی صحیفۂ
علویہ امام زین العابدین علیہ السلام کی صحیفۂ سجادیہ یا صحیفۂ سجادیہ کے علاوہ اور
دعائیں اگر ہمارے پاس علی ابن ابیطالب کی دعائے کمیل اور علی ابن الحسین
کی دعائے ابوحمزہ ثمالی کے سوا کوئی اور دعا نہ ہو اور اسلام کے پاس چودہ
صدیوں میں کوئی اور چیز نہ ہو تو اسلام کے ان دو شاگردوں کے توسط سے اس

بدویت اور جاہلیت سے پر دنیا میں ان دو آثار کا ظاہر ہونا ہی کافی ہے۔ یہ اس قدر اوج و رفعت کے حامل ہیں کہ اصلاً معجزہ اسکے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔

بہر حال کہتے ہیں کہ 'تقرب' 'تقرب واقعی ہے' اور حقیقت ہے اور انسان سچ مچ خدا سے نزدیک ہو جاتا ہے۔

خدا سے اس طرح نزدیک ہونے کے کیا معنی ہیں؟

یعنی خدا جو کمالِ مطلق ہے' ہم مسلسل زیادہ سے زیادہ کمال حاصل کریں۔ خدا علمِ علیٰ الاطلاق ہے' ہمارے علم' ایمان اور بصیرت میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ خدا قدرت علیٰ الاطلاق ہے' ہماری قدرت میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ خدا حیات علیٰ الاطلاق ہے' ہماری حیات اور ارادے میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ پس مسلۂ عبودیت (اور یہ کہ) بندگی کرو (ایک شاعر کے بقول: بندگی کن تا کہ سلطانت کنند' یا امام جعفر صادق علیہ السلام کے الفاظ میں: اَلْعُبودِیَۃُ جَوْھَرَۃٌ کُنْھُھَا الرُّبوبِیَۃُ. عبودیت کے راستے پر جس قدر آگے بڑھو گے' اتنا ہی تمہاری ربوبیت اور خداوندگاری (نعوذ باللہ خدائی نہیں) کے مالک ہونے اور تمہارے تسلط اور قدرت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ عبادت قدرت اور تسلط کے حصول کا راستہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ تسلط کس قسم کا ہے؟

اس تسلط کو ہم پانچ مرحلوں (یا ایک اعتبار سے چھے مرحلوں) میں آپ کی

خدمت میں واضح کریں گے۔ اگرچہ اس کے وہ آخری مراحل اس قسم کی نشستوں کی حدود سے زیادہ ہیں۔ لیکن کیونکہ ہم نے اوّلین مراحل کو تو عرض کرنا ہی ہے' لہٰذا آخری مرحلے کی جانب اشارہ کرنے پر بھی مجبور ہیں۔ گزشتہ نشست میں ہم نے اسکے کچھ حصوں کو عرض کیا تھا۔

عبادت کا اوّلین اثر اپنے آپ پر تسلط

عبادت جو انسان کو خدا سے نزدیک کرتی ہے' اُس کا اوّلین اثر (اپنے نفس پر تسلط ہے) یہاں سے آپ سمجھ جائیں کہ کونسی عبادت مقبول ہے' اور کونسی عبادت قبول نہیں۔ ایسی عبادت جو انسان کو خدا سے نزدیک نہ کرے' عبادت نہیں ہے۔ یعنی آپ یقین نہ کیجئے گا کہ کوئی انسان درست طریقے سے عبادت کرے لیکن خدا سے نزدیک نہ ہو۔ یہ محال ہے۔ عبادت خداوند عالم سے تقرب اور اس سے نزدیک ہونے سے مرکب ہے۔ میری اور آپ کی عبادت اس وقت مقبول ہے' جب وہ ہمیں خدا سے نزدیک کرے اور باور نہ کیجئے گا کہ انسان خدا سے' کائنات کے اس لامتناہی مرکز سے نزدیک ہو لیکن اسکی بصیرت' ایمان اور نور میں اضافہ نہ ہو' اسکی قدرت' حیات' ارادے اور اپنے آپ پر تسلط میں اضافہ نہ ہو۔

اوّلین مرحلہ' جو اس بات کو جاننے کی سب سے پہلی علامت ہے کہ ہماری عبادت پروردگار کی بارگاہ میں قبول ہوئی ہے یا نہیں ہمارے عمل کی

اجتماعی قدر و قیمت ہے' یعنی کیا؟ یعنی اگر ہم عبادت کریں۔ یہ عبادت (جو بار بار کی جاتی ہے اور بالخصوص نماز کے بارے میں زیادہ صادق آتی ہے) کس لئے ہے؟ یہ اس لئے ہے کہ یہ بات ہمیشہ ہمارے ذہن میں رہے کہ ہم بندے ہیں اور ہمارا ایک خدا ہے۔

بسا اوقات بعض افراد سوال کرتے ہیں کہ ہمارے نماز پڑھنے سے خدا کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ خدا کو کیا فائدہ ہے جو ہم نماز پڑھیں؟

دوسرا کہتا ہے: آپ کہتے ہیں کہ ہم نماز پڑھیں' خدا کے سامنے اسکی بندگی کا اظہار کریں' کیا خدا نہیں جانتا کہ ہم اسکے بندے ہیں جو ہم بار بار جا کر اسکی بارگاہ میں کھڑے ہوں اور بندگی کا اعلان کریں' تعظیم کریں' خوش آمد کریں' تا کہ خدا بھول نہ جائے کہ اُس کا ایسا بندہ ہے۔ اور اگر خدا بھول جاتا ہے' تو ایسا خدا تو خدا نہ ہوا۔ آپ جو کہتے ہیں کہ خدا کبھی نہیں بھولتا' تو پھر ہم کس لئے عبادت کریں؟

نہیں جناب' نماز اس لئے نہیں ہے کہ خدا نہ بھول جائے کہ اس کا ایسا بندہ موجود ہے' بلکہ نماز اس لئے ہے کہ بندہ نہ بھول جائے کہ اس کا خدا ہے۔ نماز اس لئے ہے کہ ہمیشہ ہمیں یاد رہے کہ ہم بندے ہیں۔ یعنی ہمارے سر پر ایک دیکھنے والی آنکھ موجود ہے' ہمارے دل میں موجود ہے' پوری کائنات میں موجود ہے۔ ہم یہ بات نہ بھول جائیں کہ ہم بندے ہیں'

لہٰذا ہماری خلقت بے کار نہیں ہے' ہم بندے ہیں' لہٰذا ہمارے فرائض اور ذمے داریاں ہیں۔ پس جب ہم نماز پڑھتے ہیں اور بار بار اللّٰہ اکبر' لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ' سبحان اللّٰہ کہتے ہیں' اور اپنی عبودیت کا اعلان اور اظہار کرتے ہیں' کہ ہم بندے ہیں' تو یہ اس لئے ہے کہ خدا کی یاد ہمیشہ ہمارے دل میں رہے۔

اِس کا کیا فائدہ ہے؟

اس مرحلے میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ ہمیں یاد ہے کہ ہم بندے ہیں' ہمیں یاد ہے کہ ہمارے فرائض ہیں' ہمیں یاد ہے کہ دنیا میں خدا کا قانون موجود ہے اور اس قانون پر عمل ہونا چاہئے' ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ایک عادلانہ قانون موجود ہے۔

ابن سینا کا کلام

عظیم اسلامی فلسفی بوعلی سینا نے' اسلام کی روشنی میں کچھ مسائل کا ذکر کیا ہے' اس سے پہلے کسی یونانی اور غیر یونانی فلسفی نے ان مسائل کا ذکر نہیں کیا تھا۔ انہی میں سے ایک مسئلہ وہ یہ چھیڑتے ہیں کہ انسان مدنی بالطبع ہے۔ اسکے بعد عبادت کے مسئلے میں داخل ہوتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ اجتماعی نکتۂ نظر سے (وہ اجتماعی نکتۂ نظر سے بھی گفتگو کرتے ہیں اور غیر اجتماعی نکتۂ نظر سے بھی) اور انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے خدا کو پہچانتا ہو اور اسے

پہچاننے کے بعد متوجہ ہو کہ اس خدا کی جانب سے انسانی زندگی کے لئے ایک عادلانہ قانون موجود ہے اور پھر واجب اور لازم ہے کہ عبادت کا وجود ہو۔ عبادت کو بھی مکرر ہونا چاہئے' تاکہ ہمیشہ انسان کو یاد رہے کہ وہ بندہ ہے اور اُس کا ایک خدا ہے۔ جب اسکی روح میں یہ یاددہانی اور تلقین موجود ہوگی' تو یہ اسکے گناہ اور معصیت کا شکار ہونے میں مانع ہوگی۔ وہ ظلم کرنا چاہے گا' تو نماز آ کر اسکی آنکھوں کے سامنے مجسم ہو جائے گی' اور کہے گی کہ تو نے تو عبودیت کا اقرار کیا ہے' تو نے تو کہا ہے کہ میں آزاد نہیں ہوں' (پس کیوں ظلم کرنا چاہتا ہے؟) (۱) یہاں کونسا قانون پایا جاتا ہے؟ کہتے ہیں: **وفرضت علیھم العبادۃ المفروضۃ بالتکریر** 'عبادت اس لئے واجب کی گئی ہے' تاکہ انسان کی روح میں ایک ایسی قوت پیدا ہو' کہ اس قوت کے اثر سے جو ایمان سے تجدیدِ عہد ہے مسلسل اس کے ایمان کی تجدید ہوتی رہے اور یہ ایمان گناہ کرنے میں مانع ہو جائے۔

یہ اس تسلط کا اوّلین درجہ ہے جو اپنے اوپر انسان عبادت کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ اس مرحلے کو ہم نے گزشتہ نشست میں ایک حد تک آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا' کہ عبادت کی ایک قطعی خاصیت انسان کا خود اپنے نفس پر تسلط ہے۔ یعنی انسان کا اپنی شہوات پر تسلط' انسان کا اپنی جاہ طلبی پر تسلط'

۱۔ یہاں کیسٹ میں چند سیکنڈ کی تقریر ریکارڈ نہیں ہوئی ہے۔

انسان کا اپنی جبلتوں پر تسلط' انسان کا اپنے اعضا و جوارح پر تسلط' انسان کا اپنی آنکھ پر تسلط' انسان کا اپنی زبان پر تسلط' انسان کا اپنے کان پر تسلط' انسان کا اپنے ہاتھ پر تسلط' انسان کا اپنے پیر پر تسلط' الغرض انسان کا اپنے پورے وجود پر تسلط۔ اگر (یہ خاصیت) نہ ہو (تو ایسی عبادت) عبادت نہیں۔ قرآنِ کریم کی نص کے مطابق: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ. "اَلْعُبُودِیَّۃُ جَوْھَرَۃٌ کُنْھُھَا الرُّبُوبِیَّۃُ." کے ذریعے (ہمیں پتا چل چکا ہے کہ) خداوندگاری' قدرت و تسلط کا اوّلین مرحلہ' اور لامتناہی قدرت کے مرکز (خدا) سے قربت کی اوّلین علامت' اپنے قوہ' جبلتوں' شہوات' نفسانی خواہشات پر تسلط اور اپنے اعضا پر غلبہ ہے' ہم خود اپنے آپ پر مسلط ہوں۔

یہ مرحلہ' عام افراد کا مرحلہ ہے۔ عام افراد اگر عبادت کریں بھی تو ضروری نہیں کہ انہوں نے انتہائی مشق کی ہو' وہ اس مرحلے پر پہنچتے ہیں۔ یہ جو ہم عرض کر رہے ہیں کہ "عام افراد" تو اس سے یہ تصور نہ کیجیے گا کہ پس ہماری اور آپ کی کوئی ذمے داری نہیں ہے' نہیں ہماری بہت اہم ذمے داری ہے۔

اپنے قوہ' خیال پر تسلط

اس مرحلے سے جب ہم گزر جاتے ہیں' تو ایک بالاتر اور عالی تر مرحلہ ہے' اور وہ اپنے تصورات اور خیالات پر تسلط ہے۔ یعنی ابھی ہم اور آپ جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں' دن کے وقت اپنے کام کاج اور روزگار کے سلسلے میں

مشغول ہوتے ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے تصورات اور خیالات ہمارے اختیار میں ہیں اور ہم اپنے اوپر حاکم ہیں۔ ہم اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ ہم پر ہمارے فکر و خیال کا حکم چلتا ہے (یہاں فکر سے مراد قوۂ خیال ہے) یعنی کچھ بکھرے ہوئے افکار ہم پر حاکم ہوتے ہیں۔ آپ ایک جلسے میں بیٹھ جائیں، اگر آپ اپنے ذہن کو ایک گھنٹے کے لئے ایک خاص موضوع پر مرکوز کر سکیں۔ اس انداز سے کہ آپ کی قوۂ خیال آپ کے قابو سے باہر نہ نکل سکے، تب پتا چلے گا کہ آپ اپنے فکر و خیال پر مسلط ہیں۔

نماز حضورِ قلب کے لئے ہے۔ حضورِ قلب دراصل ہے کیا؟ یہ حضورِ قلب کا مسئلہ ایک انتہائی عجیب تعبیر ہے۔ حضورِ قلب، یعنی دل حاضر ہو غائب نہ ہو۔ یعنی جب آپ نماز پڑھ رہے ہوں اور آپ قبلہ رخ ہوں، تو اپنا جائزہ لیں، دیکھیں کہ آپ کا دل نماز میں حاضر ہے یا غائب؟ آپ نماز کی ابتدا میں اپنے دل کو دیکھتے ہیں، وہ حاضر ہو جاتا ہے۔ آپ کا دل بھی چاہتا ہے کہ وہ حاضر رہے۔ جب آپ اللہ اکبر، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین کہتے ہیں، تو یکا یک آپ دیکھتے ہیں کہ جماعت کا یہ طالبِ علم بھاگ گیا ہے، آپ نے اوّل سے آخر تک درس دیا ہے لیکن طالبِ علم کلاس میں نہیں تھا۔ جب ہم نماز پڑھتے ہیں اور الحمد للہ رب العالمین کہتے ہیں، تو ہم اپنے دل کو تفہیم کرنا چاہتے ہیں، اپنی روح کو تلقین کرنا چاہتے ہیں، لیکن جب ہم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و

برکاتہ کہتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ یہ ہمارا جسم' یعنی ہماری زبان اور ہمارے اعضاو جوارح ہمارے دل کو درس دینے میں مشغول تھے' اور جماعت کا طالب علم یہ دل تھا' لیکن افسوس کہ یہاں صورتحال یہ تھی کہ ہم نے درس دیا' جماعت کے طالب علم نے ابتدا میں اپنے حاضر ہونے کا اعلان کیا اور بعد میں بھاگ گیا اور ہم نے درس دیا اور فضول درس دیا۔

ہم سے حضورِ قلب کے لئے کہا گیا ہے' نماز میں تمہارا دل حاضر رہے' غائب نہ ہو۔ اس بارے میں اب بھی بہت سی باتیں ہیں۔ علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی ایک روایت ہے' رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے' اور علما میں سے جس نے سب سے بہتر انداز میں اس نکتے کو بیان کیا ہے وہ شیخ الرئیس بوعلی سینا ہیں' وہ عارف کی عبادت کے باب میں کہتے ہیں: **و العبادة عند العارف رياضةٌ ما لهممه و قواه المتخيلة و المتوهمة ليجرّها با لتعو يد عن جناب الغرور الى جناب القدس.** (یہ مضمون ہو بہو حدیث کا مضمون ہے۔ ایک درس ہے جو بوعلی نے پیغمبر اور ائمہ سے لیا ہے) کہتے ہیں کہ ایک عارف انسان جو عبادت کرتا ہے' ایک دانا اور شناسا انسان جب عبادت کرتا ہے' تو عبادت کے دوران ہر چیز سے زیادہ' اپنے قوۂ خیال کے تمرکز کو اہمیت دیتا ہے' تاکہ اسکا ذہن خدا کی طرف متوجہ ہو جائے اور قوۂ خیال ہمیشہ حاضر ہو اور اس کلاس سے فرار نہ کرے۔

دل کے لئے پیغمبر اکرم کی تعبیر

دل کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک تعبیر ہے۔ اس قسم کے دل جو ہمارے پاس ہیں' وہ دل جو ہمارے اختیار سے باہر ہیں۔ انتہائی عجیب تعبیر ہے! پیغمبر اکرم ایک مثل بیان کرتے ہیں' فرماتے ہیں: "اِنَّما مَثَلُ هٰذَا الْقَلْبِ كَمَثَلِ رِيشَةٍ فِي فَلَاةٍ مُعَلَّقَةٍ عَلٰى شَجَرَةٍ تُقَلِّبُهَا الرِّيحُ ظَهْراً لِبَطْنٍ." انسانوں کے دل کی مثل' وہ انسان جن کے دل کی تربیت نہیں ہوئی ہے' اور اب تک انہوں نے عبادت کی مشق نہیں کی ہے' ایک پر کی (مثلاً ایک پرندے کے پر کی) مثل ہے۔ اگر آپ ایک پر کو صحرا و بیابان میں' ایک درخت پر لٹکا دیں' اسکے بعد یہ دیکھیں کہ کیا یہ پر ایک حالت میں ٹھہرا رہتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ مسلسل کبھی اِس طرف اور کبھی اُس طرف ہوتا رہتا ہے۔ ہوا کا ایک انتہائی معمولی جھونکا' جس کے چلنے کا آپ کو احساس بھی نہیں ہوتا' آپ دیکھتے ہیں کہ {اس ہوا کے اثر سے} یہ پر اس شاخ پر حرکت کرنے لگتا ہے۔ کہتے ہیں بنی آدم کے قلب (جس سے یہاں قوۂ خیال مراد ہے) کی مثل' قوۂ خیال کی مثل ہے' جو ایک جگہ نہیں ٹھہرتا' اس شاخ سے اس شاخ پر اڑتا پھرتا ہے' انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ اس پر کی مثل ہے' جو بیابان میں ایک شاخ پر آویزاں ہو' جو ایک جگہ نہیں ٹھہرتا۔ مولانا روم اسی مضمون کو شعر میں لائے ہیں:

گفت پیغمبر کہ دل ہمچون پری است

در بیابانی بہ دست صرصری

کیا تمام دل اسی طرح کے ہوتے ہیں؟

نہیں، ہرگز نہیں۔

لازماً آپ کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام کا دل بھی نعوذ باللہ اسی طرح کا تھا۔ نہیں، ایسا نہ تھا۔ نہ صرف علی ابن ابی طالب، بلکہ اُن کے معمولی سے شاگرد بھی اس طرح کے نہیں تھے۔

کیا اویس قرنی، عمار یاسر اور کمیل ابن زیادہ نخعی اسی طرح کے تھے؟

نہیں ہرگز نہیں۔

حتیٰ ان سے بھی کمتر لوگوں کو ہم نے دیکھا ہے۔ وہ افراد جنہیں ہم نے اپنے زمانے میں دیکھا ہے، ان میں بھی، ان افراد میں بھی ہم نے بہت دیکھا ہے کہ یہ لوگ اپنے قوۂ خیال کے مالک اور اپنے قوۂ خیال پر مسلط ہیں۔ یعنی خدا کی عبودیت اور بندگی کے زیرِ اثر وہ اپنے اندر ایسی قوت پیدا کر سکے ہیں کہ اگر وہ چاہیں کہ مسلسل ایک گھنٹے اپنے ذہن کو ایک نقطے پر مرکوز رکھیں، اس طرح سے کہ اس پورے وقت میں ان کا ذہن ذرہ برابر بھی کسی اور نقطے کی طرف متوجہ نہ ہو، تو وہ ایسا کر سکے ہیں۔ یہ خود ایک قدرت اور تسلط ہے، اور خداوند تبارک و تعالیٰ سے واقعی قرب کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس قسم کی چیز ممکن

ہے۔ بنیادی طور پر ان لوگوں کی اہمیت اسی بنا پر ہے کہ وہ اپنی فکر و خیال پر حاکم ہیں، فکر یعنی خیال ان پر حکومت نہیں کرتا۔ اس قسم کے نکتے کو مولانا روم نے کس قدر عالی بیان کیا ہے! پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا: یَنامُ عَینی وَلا یَنامُ قَلبی. میری آنکھ سوتی ہے، لیکن میرا دل بیدار رہتا ہے۔ ہمارے برعکس کہ ہماری آنکھ بیدار ہے اور ہمارا دل عالمِ خواب میں ہے۔ پیغمبر نے فرمایا ہے کہ میں آنکھ سے سوتا ہوں، میرا دل بیدار ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

گفت پیغمبر کہ عینای ینام

لاینام القلب عن رب الانام

کس قدر عالی ہے!

چشم تو بیدار و دل رفتہ بہ خواب　　　چشم من در خواب و دل در فتح یاب

حاکم اندیشہ ام محکوم نی　　　چون کہ بنا حاکم آمد بر بنی

میری اور میرے فکر و خیال کی مثل بنّا {معمار} اور بنا {عمارت} کی سی ہے، اسے میں نے بنایا ہے، فکر و خیال نے مجھے نہیں بنایا ہے۔

من چو مرغ او جم اندیشہ مگس

کی بود بر من مگس را دسترس

یہ دوسرا (اور ایک اعتبار سے تیسرا) مرحلہ ان مراحل میں سے ہے کہ

انسان تسلط اور قدرت پیدا کرتا ہے۔

روح کا بدن سے بے نیاز ہو جانا

کیا دوسرے مراحل بھی ہیں؟ اگرچہ یہ مراحل ہماری سطحِ فکر اور تصورات سے بعید ہیں لیکن صرف اس بنا پر کہ دور اور بعید ہیں ہمارے لئے یہ عذر نہیں ہوتا کہ ہم انہیں نہ پہچانیں اور ان سے بے خبر رہیں۔ جی ہاں! ایک بالاتر مرحلہ بھی ہے (البتہ یہ خیال نہ کیجئے گا کہ جن مراحل کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں، وہ امام یا پیغمبر کے مراحل ہیں، امام اور پیغمبر کے مرحلے تک پہنچنے سے پہلے بہت سے مراحل ہیں) انسان خداوندِ عالم سے تقرب کے نتیجے میں (اور خداوندِ عالم سے تقرب عبودیت، اخلاص، اپنے آپ کو بھول جانا، پروردگارِ عالم کے مقابل خضوع و تذلل اور اسکے مقابل اطاعتِ محض کا نتیجہ ہے) ایک ایسے مرحلے پر پہنچ جاتا ہے کہ باوجود یہ کہ اُس کا بدن روح کا محتاج ہوتا ہے، اُسکی روح بدن سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔

ایسا کیسے ہوتا ہے؟

اس وقت ہماری روح ہمارے بدن کی محتاج ہے، اور ہمارا بدن بھی ہماری روح کا محتاج ہے۔ اس وقت اگر وہ روح اور وہ قوۂ حیات نہ ہو، تو ہمارا یہ بدن زندہ نہیں رہے گا۔ اگر ہمارا یہ بدن بھی نہ ہو، تو ہماری روح بھی یہاں کسی کام کی نہ رہے گی، وہ کوئی کام نہیں کر سکے گی۔

لیکن کیا تمام انسان اسی طرح کے ہیں کہ ان کا بدن بھی روح کی ضرورت رکھتا ہے اور ان کی روح بھی بدن کی محتاج ہوتی ہے؟ یا یہ کہ بعض انسان خدا سے تقرب اور پروردگار کی عبودیت کے نتیجے میں اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ کم ازکم ان کی روح ان کے بدن سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔

کیسے بے نیاز ہو جاتی ہے؟

یعنی وہ یہ قدرت حاصل کر لیتے ہیں کہ بقول روح کو اس بدن سے نکال لیتے ہیں (البتہ یہاں نکالنے کے معنی مرجانا نہیں ہیں) یعنی بدن کے مقابل روح کے استقلال کو محفوظ رکھتے ہیں۔

خود ہمارے زمانے میں ایسے اشخاص موجود ہیں جو روح کو نکالنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یعنی روح کو بدن سے جدا کرتے ہیں' اس طرح کہ اپنے آپ کو اس بدن پر مسلط دیکھتے ہیں۔ اپنے بدن کو دیکھتے ہیں کہ مثلاً یہاں عبادت میں مشغول ہے اور وہ خود کسی دوسری جگہ کی سیر کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک وسیع ترین دریچہ اُن کے سامنے کھلا ہوتا ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی' جو "شیخ اشراق" کے نام سے معروف ہیں' اُن کی ایک عبارت ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم حکیم کو اس وقت تک حکیم نہیں سمجھتے' جب تک اس میں اس بات کی قدرت نہ ہو کہ وہ اپنی روح کو اپنے بدن سے علیحدہ کر لے۔ میر داماد کہتے ہیں: ہم حکیم کو حکیم صرف اسی وقت سمجھتے ہیں جب بدن کو (روح سے) خالی کرنا

اسکے لئے ملکہ بن چکا ہو۔ یعنی جب بھی وہ ارادہ کرے اپنی روح کو بدن سے مستقل اور جدا کر سکے۔

ہمارے لئے یہ باتیں انتہائی سنگین اور زیادہ ہیں۔ ہم ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ ہمیں ان پر یقین نہ رکھنے کا حق بھی ہے۔ کیونکہ ہم ان مراحل سے بہت دور ہیں۔ لیکن اس بدگمانی اور بے یقینی سے ذرا اوپر اٹھئے۔ ہم تو نہیں گئے ہیں ہم نے تو عبودیت کے راستے کے اس پہلے ہی مرحلے کو طے نہیں کیا ہے تا کہ دیکھ سکیں کہ کیا خدا کی عبادت کا اتنا اثر بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ ہم نے ایک بھی ماہِ رمضان میں ایک بھی صحیح روزہ نہیں رکھا ہے۔ آپ اسی ماہِ رمضان میں حقیقتاً تجربہ کر کے دیکھئے۔ آپ دنیا کے تمام کاموں میں تجربہ کرتے ہیں۔ ایک ماہِ رمضان میں تجربہ کیجئے اور ایک واقعی روزہ ایسا روزہ جیسا پیغمبر اکرم نے فرمایا ہے اور ائمہ اطہار نے حکم دیا ہے رکھئے۔ یعنی پہلے تو روزے کے ظاہر پر جو کھانے پینے کی اشیا اور کچھ دوسری چیزوں کو ترک کرنا ہے عمل کیجئے۔ البتہ یہ کام ہم سب کرتے ہیں۔ لیکن وہ روزہ جسے حدیث میں روزۂ خاص کہا گیا ہے اس روزے کو بھی رکھ کر دیکھیں۔ یعنی اس ایک ماہ میں صرف ہمارا دہان روزے سے نہ ہو بلکہ ہماری زبان بھی روزہ رکھے۔ ماہِ رمضان میں کوشش کریں کہ ہماری زبان غیبت نہ کرے جھوٹ نہ بولے خواہ یہ جھوٹ اسکے انتہائی فائدے میں ہو۔ زبان روزہ نہ توڑے جھوٹ نہ بولے کیونکہ روزہ

صرف کھانے سے پرہیز کا نام نہیں ہے۔ پیغمبر اکرم نے فرمایا ہے: رُبَّ صائِمٍ لاحَظَّ لَهُ إلّا الجوعُ وَالعَطَشُ. بہت سے روزہ دار ایسے ہوتے ہیں' روزے سے جن کے حصے میں سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ نہیں آتا۔ ہماری زبان بیہودہ اور لغو باتیں نہ بولے' وہ الفاظ جو ہماری دنیوی زندگی یا ہماری آخرت کے لئے ضروری ہوں ان کے سوا کوئی لفظ نہ بولے۔ ہمارے کان غیبت نہ سنیں' لہو ولعب نہ سنیں' فحش کلامی نہ سنیں۔ ہماری آنکھیں دوسروں کی عزت وآبرو پر نہ اٹھیں۔ ہمارے ہاتھ خیانت کے لئے دراز نہ ہوں۔ ہمارے قدم خیانت اور ظلم کی طرف نہ بڑھیں۔ اسکے مقابل' اس ماہِ رمضان کو اطعام (دوسروں کو کھانا کھلانا) دلجوئی' محبت' احسان اور خدمت گزاری کا مہینہ قرار دیں۔

امتحان کریں' ایک ماہِ رمضان انسان بننے کی کوشش کریں۔ اس وقت آپ دیکھیں گے کہ ایک ماہ بعد' عبادت اور عبودیت اپنا اثر بخشتی ہے یا نہیں' دیکھیں کہ ایک ماہ بعد یہی روزہ آپ کو بدلتا ہے یا نہیں' دیکھیں کہ ایک ماہ بعد یہی روزہ آپ کو ربوبیت یعنی خداوندگاری اور تسلط وقدرت دیتا ہے یا نہیں۔ اگر آپ دیکھیں کہ نہیں دیا' تب آپ ان بعد کے مراحل کا انکار کیجئے۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ نہیں' اس ایک مہینے میں آپ نے اس قدر ربوبیت' خداوندگاری' تصاحب' یعنی اپنے نفس پر' اپنی جبلتوں اور شہوات پر' اپنے اعضا و

جوارح پر تسلط حاصل کر لیا ہے' تو پھر یقین کر لیجئے گا کہ وہ اگلے مراحل بھی عملی ہیں۔

بدن پر تصرف کی قدرت

کیا اس سے بھی بڑھ کر ہے؟ کیا عبودیت کی یہ سواری انسان کو اس سے زیادہ خدا سے نزدیک کرتی ہے اور کیا انسان کو اس سے زیادہ قدرت و توانائی دیتی ہے؟

جی ہاں' نہ صرف اس کا رابطہ (یعنی انسان کا اپنے بدن سے رابطہ) اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ روح بدن سے مستقل ہو جاتی ہے' اور بدن سے اپنی نیاز سلب کر لیتی ہے' اس مرحلے پر جا پہنچتی ہے کہ اپنے بدن پر جو بھی تصرف کرنا چاہتی ہے کر لیتی ہے۔ حتیٰ {انسان} یہ قدرت بھی حاصل کر لیتا ہے (ہم جانتے ہیں کہ آپ میں سے بعض لوگ شاید اس بات پر دیر سے یقین کریں) کہ ایک گھنٹے تک اپنی حرکتِ قلب کو روک لیتا ہے' اور نہیں مرتا۔ اس بات کی قدرت حاصل کر لیتا ہے کہ دو گھنٹے سانس نہ لے اور نہیں مرتا۔ اس بات کی قدرت حاصل کر لیتا ہے کہ اس بدن کے ساتھ طی الارض کرے۔ ہاں' {انسان} ایسی قدرت حاصل کر لیتا ہے۔ یہ عبادت کا اثر ہے۔

بیرونی دنیا پر تصرف کی قدرت

کیا اس سے بھی بڑھ کر ہے؟ جی ہاں' اگر آپ وحشت کا شکار نہ ہوں' تو

اس سے بلند تر بھی ہے۔ وہ بالاتر مرحلہ وہ قدرت ہے کہ انسان خدا کی بندگی اور عبودیت کے اثر سے اور ذاتِ اقدسِ الٰہی سے قرب کے اثر سے اور ہستی کے لامتناہی مرکز سے نزدیک ہونے کے زیر اثر اپنے سے باہر کی دنیا میں بھی تصرف کرسکتا ہے۔ وہ ایک عصا کو اژدھے میں بدل سکتا ہے وہ چاند کے گولے کو دو حصوں میں تقسیم کرسکتا ہے وہ تختِ بلقیس کو پلک جھپکتے میں یمن سے فلسطین لاسکتا ہے۔ جی ہاں کرسکتا ہے۔ "اَلْعُبُودِیَّۃُ جَوْھَرَۃٌ کُنْھُھَا الرُّبُوبِیَّۃُ." لیکن یہ مراحل ہم سے بہت دور ہیں۔ ہم اپنے ہی مرحلے کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

ہم جو آج رات یہاں جمع ہوئے ہیں قطع نظر اسکے کہ یہ رات احیا کی راتوں میں سے ایک رات ہے جسے ہمیں جاگ کر بسر کرنا چاہیے۔ لیکن اس رات کو ایک اعتبار سے ایک برکت وسعادت حاصل ہے اور ایک اعتبار سے ایک نحوست اور بدشگونی بھی۔ نحوست اس اعتبار سے ہے کہ ایسی ہی ایک رات کو ہم علی ابن ابیطالب جیسی ہستی سے محروم ہوئے ہیں اور برکت وسعادت اس اعتبار سے ہے کہ علی ابن ابیطالب کا جانا ایک عام جانا نہیں تھا۔ ایک ایسا جانا ہے جو واقعاً "مبارکباد" کا حامل ہے۔ جیسے کہ "صعصعہ بن صوحان عبدی" امیر المومنین کے دفن کی شب جب امیر المومنین کی قبر کے سرہانے آیا کھڑا ہوا (وہ اور گنتی کے چند اور امیر المومنین کے خاص ساتھی تھے جنہیں امام حسن مجتبیٰ

سلام اللہ علیہ نے اس موقع پر بلایا تھا) اور کہا کہ کیسی اچھی زندگی بسر کی اور کیسی عالی موت پائی!

آج کی رات احیا کی شب بھی ہے اور وہ رات بھی ہے جو امیر المومنین علی علیہ السلام سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ حضرت علی کو دوسروں کی نسبت کیا خصوصیت اور امتیاز حاصل ہے کہ آپ علی کے اس قدر شیفتہ ہیں؟ علی کی آپ سے کیا رشتہ داری ہے؟ کوئی نہیں۔ علی کا آپ سے کیا مادّی تعلق ہے؟ کسی قسم کا مادّی تعلق نہیں ہے۔ علی کا امتیاز اور ان کی خصوصیت کیا ہے؟ علی کی خصوصیت عبودیت اور بندگی ہے۔ علی خدا کے ایک کامل صالح بندے ہیں۔ ایک ایسے بندے ہیں جو بندگی کے سوا کسی اور بات کے بارے میں نہیں سوچتے۔ ایک ایسے بندے ہیں کہ ربوبیت اور تسلط کے اُن تمام مراحل کو جن کے متعلق ہم نے عرض کیا علی نے اعلیٰ حد تک طے کیا ہے۔ ایک ایسے بندے ہیں جو ہمیشہ خدا کو اپنے اعمال پر حاضر و ناظر سمجھتے ہیں۔

مالک اشتر نخعی کو کیا عالی تحریر کیا ہے! مالک اشتر کو حضرت علی علیہ السلام کا فرمان جو نہج البلاغہ میں موجود ہے اسلام کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔ انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ چودہ سو سال پہلے ایسی گنوار اور وحشی قوم کے درمیان ایک ایسا عظیم الشان اجتماعی دستورِ عمل (صادر ہوتا ہے) کہ انسان کو خیال گزرتا ہے کہ اسے انیسویں اور بیسویں صدی میں کچھ فلاسفہ نے بیٹھ کر

تحریر کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ لوگ جو معجزے کی تلاش میں رہتے ہیں' وہ خیال کرتے ہیں کہ بس معجزہ یہ ہے کہ عصا' اژدھا بن جائے۔ یہ معجزہ عوام کے لئے ہے۔ عالم لوگوں کے لئے دعائے کمیل' دعائے ابوحمزہ ثمالی اور مناجات شعبانیہ معجزہ ہیں' مالکِ اشتر کے نام حضرت علی علیہ السلام کا فرمان معجزہ ہے۔ اس فرمان میں آپ یوں تحریر فرماتے ہیں: مالک! خیال نہ کرنا کہ اب جبکہ تم مصر گئے ہو' تو اب ان لوگوں کے والی اور ان سے برتر ہو گئے ہو اور لوگوں کو اپنی رعایا سمجھنے لگو۔ لہٰذا ایک درندے بھیڑیے کی طرح جو دل چاہے کرتے پھرو۔ نہیں' ایسا نہیں ہے۔ لوگوں کی تقسیم کرتے ہیں: وہ جو مسلمان ہیں' وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور وہ جو مسلمان نہیں ہیں' وہ تمہارے ہم نوع انسان ہیں۔ اسکے بعد آخر میں (ہماری گفتگو کا شاہد یہی ہے) فرماتے ہیں: مالک! فَاِنَّکَ فَوْقَھُمْ. تم اپنی رعیت پر بالادست بنائے گئے ہو۔ وہ محکوم ہیں اور تم حاکم۔ لیکن وَالِی الْاَمْرِ عَلَیْکَ فَوْقَکَ. جس ہستی نے یہ فرمان تمہارے نام تحریر کیا ہے اور اس ابلاغ کو تمہارے لئے صادر کیا ہے' اور جو میں ہوں' وہ تمہارے اوپر ہے۔ میں تم پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ اگر تم نے کوئی غلطی کی' تو تمہیں اسکی سزا دوں گا۔ وَاللّٰهُ فَوْقَ مَنْ وَلاَّکَ (۱) اور پروردگارِ اقدس کی ذات اس کے اوپر ہے جس نے تمہیں مصر کے لوگوں کا حاکم بنایا ہے۔ خدا علی

۱۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۵۳

کے اوپر ہے اور علی ہمیشہ اپنے خدا سے خوفزدہ رہتا ہے کہ کہیں کوئی خطا سرزد نہ ہو جائے۔

دوسرا مرحلہ' جو خیال اور فکر کے تمرکز کا مرحلہ ہے (اس کے تعلق سے) اب اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ علی نماز میں کھڑے ہوتے ہیں' خدا اور عبادت میں ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ وہ تیر جو آپ کے پائے مبارک میں پیوست ہے اور اگر عام حالت میں اسے آپ کے پیر سے نکالیں تو بہت تکلیف دے اور شاید بے تاب کر دے' حالتِ نماز میں آپ کے بدن سے باہر نکالتے ہیں اور آپ کو محسوس بھی نہیں ہوتا۔

حضرت علی علیہ السلام کو جو عظمت و منزلت حاصل ہے وہ آپ کی شخصیت کے انہی پہلوؤں کی وجہ سے ہے۔ حضرت علی علیہ السلام ایک ایسے مرحلے پر پہنچ چکے ہیں کہ طی الارض اور اس طرح کے مسائل آپ کے لئے انتہائی آسان ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ایک جاہل و نادان شخص نے کہا ہے کہ ایک ڈیڑھ میٹر یا دو میٹر کے انسان (یعنی العیاذ باللہ علی ابن ابیطالب علیہ السلام) کے لئے جو اس قدر فضائل اور معجزات بیان کئے جاتے ہیں وہ گھڑے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس قسم کے مسائل کا تعلق انسان کے قد کاٹھ سے ہے۔ لہٰذا ایک ایسا شخص جس کا قد دو میٹر ہو وہ زیادہ موثر ہوا کرتا ہے۔ اس قسم کے انسانوں کی

نظر میں اگر دنیا میں کوئی معجزہ وجود رکھتا ہے تو اسکا تعلق "اوج بن عُنُق" سے ہے۔ کیونکہ وہ عظیم الجثہ تھا۔ یہ لوگ انسان کو پہچاننا کیوں نہیں چاہتے؟ کیوں خدا کو نہیں پہچاننا چاہتے؟ کیوں تقرب الٰہی کو نہیں سمجھنا چاہتے؟ کیوں عبودیت کے معنی نہیں سمجھنا چاہتے؟ اگر کوئی کہتا ہے کہ ولایتِ تکوینی یعنی اس نے یہ نہیں کہا ہے کہ خدا نے دنیا کے کام کو نعوذ باللہ ایک انسان کے سپرد کر دیا ہے اور خود ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا ہے ایسی چیز محال ہے۔ ولایتِ تکوینی یعنی بنیادی طور پر عبودیت کا پہلا قدم ولایت ہے۔ لیکن درجہ بدرجہ (ولایت یعنی تسلط و قدرت) اس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ اس ہاتھ کا مالک ہو جائے اس آنکھ کا مالک ہو جائے اس کان کا مالک ہو جائے اپنے پیر کا مالک ہو جائے اپنی جبلتوں کا مالک ہو جائے۔ دوسرا قدم اپنے فکر و خیال کا مالک ہو جائے اپنے بدن کے مقابل اپنے نفس کا مالک ہو جائے۔ قدم بقدم (آگے بڑھتا ہے) یہاں تک کہ عالمِ تکوین پر بھی کچھ تسلط حاصل کر لیتا ہے۔ پھر یہ باتیں نہیں کیا کرتا یہ باتیں بے شعوری اور بے معرفتی کا نتیجہ ہیں۔ ہمیں علی اس لئے محبوب ہیں اور ہم اس لئے علی کے شیفتہ ہیں کہ یہ بات انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہے۔ وہ شخص جو خود اپنے آپ سے بے خود ہو گیا ہے وہ جس کی دنیا میں اب خودی نہیں پائی جاتی جو کچھ ہے خدا ہے اور خدا کے سوا کوئی اور چیز اسکی بساط میں نہیں۔

علیؑ بسترِ شہادت پر

آیئے پروردگار کے اس صالح بندے کی عیادت کو چلتے ہیں۔ آج کی رات علی کے بچوں کے لئے، علی کے شیعوں اور دوستوں کے لئے انتہائی پر اضطراب رات ہے۔

کم و بیش بہت سے لوگ سمجھ چکے تھے کہ علیؑ اس مسموم ضربت سے نہیں بچ سکیں گے۔ جیسا کہ آپ نے سنا ہے، علیؑ نے جنگِ خندق میں عمرو بن عبدود سے ایک سخت ضرب کھائی تھی، یہ ضرب علیؑ کے فرقِ نازنین پر پڑی تھی اور سپر کو توڑتی ہوئی امام کے سر میں ایک شگاف کا باعث بنی تھی۔ البتہ ایسی نہ تھی کہ خطرناک ہوتی اور بعد کے مرحلے میں امام نے عمرو کو زمین پر پٹخ دیا تھا۔ یہ زخم صحیح ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس ازل و ابد کے لعین (ابن ملجم) کی ضربت اسی جگہ پر پڑی تھی، جہاں اس سے پہلے عمرو بن عبدود کی ضربت لگی تھی۔ حضرت علی کے سرِ اقدس میں ایک بڑا شگاف پڑ گیا تھا۔ بہت سے لوگوں کو اب بھی اس بات کی امید تھی کہ علی صحت یاب ہو جائیں گے۔ حضرت علیؑ کے بچوں میں سے ایک، ظاہراً ان کی محترم صاحبزادی ام کلثوم کی گزرتے ہوئے عبدالرحمٰن ابن ملجم پر نظر پڑی، انہوں نے کہا: اے ازل و ابد کے لعین! مجھے امید ہے تیری تمنا پوری نہ ہوگی، خدا میرے والد کو شفا عنایت کرے گا۔ (ابن ملجم) مسکرایا اور کہا کہ میں نے اس تلوار کو ہزار درہم میں خریدا ہے، یہ بہت کارآمد تلوار ہے، اور میں نے

اسے زہر میں بجھانے کے ہزار درہم ادا کیے ہیں' میں جانتا ہوں کہ یہ ضربت جو میں نے تمہارے باپ کے سر پر لگائی ہے' اگر اسے تمام انسانوں پر تقسیم کیا جائے' تو سب لوگ مر جائیں گے۔ آپ خاطر جمع رکھئے۔ اس بات نے علیؑ کے بچوں کی امید کو بڑی حد تک توڑ دیا۔ کہا کہ طبیب کو بلاؤ۔ ایک شخص ہے جس کا نام "ہانی بن عمرو سلولی" ہے' ظاہراً یہ شخص (جیسا کہ ایک مرتبہ میں نے تاریخ میں پڑھا) ایک ایسا طبیب تھا جس نے "جندی شاپور" کی یونیورسٹی سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی' یہ یونیورسٹی ایران میں تھی اور ایران کے عیسائی اسے چلاتے تھے۔ یہ شخص کوفہ میں مقیم تھا۔ لوگ گئے اور اسے لے کر آئے' تا کہ معائنہ کرے' بلکہ ہو سکے تو علاج کرے۔ لکھا ہے کہ اس نے ایک گوسفند یا ایک بکرے کو ذبح کرنے کو کہا۔ اسکے پھیپھڑے سے اس نے ایک رگ باہر نکالی' اس رگ کو گرم گرم اس زخم کی جگہ میں داخل کیا' وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس زہر کے آثار کس قدر ہیں' یا جاننا چاہتا تھا کہ یہ کس قدر نفوذ کر گیا ہے' ان باتوں کو اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔ لیکن صرف اس قدر جانتا ہوں کہ تاریخ میں یہ لکھا ہے۔ یہ شخص اپنی طبی آزمائش سے فارغ ہوا' تو خاموش بیٹھ گیا' کوئی لفظ منہ سے نہ نکالا' صرف اتنا کیا کہ امیر المومنین کی طرف رخ کر کے عرض کیا کہ: اے امیر المومنینؑ! اگر آپ کی کوئی وصیت ہے تو کر دیجئے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت علیؑ کے گھرانے' علیؑ کے اعزہ اور علیؑ کے شیعوں کی امید ختم ہوگئی۔

علیؑ مہر و محبت اور بغض و عداوت ہر دو چیزوں کا مرکز ہیں۔ آپ کے ایسے ایسے محب ہیں جو آپ سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور آپ کے دشمن بھی انتہائی شدید ہیں' جیسے عبدالرحمٰن ابن ملجم۔ اسی طرح آپ کے دوست بھی عجیب و غریب تھے۔ ان دو راتوں اور دنوں میں' حضرت علیؑ کے دوستوں میں ایک ولولہ پایا جاتا تھا' وہ علی کے گھر کے گرد جمع تھے اور وہ سب علیؑ کی عیادت کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ سب کہہ رہے تھے کہ ایک بار ہمیں اپنے مولا کے جمال کے دیدار کی اجازت دے دیجئے۔ کیا ممکن ہے کہ ہم ایک مرتبہ پھر علیؑ کی آواز سن سکیں' علیؑ کا رخِ انور دیکھ سکیں؟ ان میں سے ایک ''اصبغ بن نباتہ'' ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ لوگ علیؑ کے گھر کے گرد جمع ہیں' مضطرب ہیں اور گریہ و بکا کر رہے ہیں' سب داخلے کی اجازت ملنے کے منتظر ہیں۔ یکلخت میں نے دیکھا کہ امام حسنؑ باہر تشریف لائے اور اپنے والدِ بزرگوار کی طرف سے لوگوں سے ان کی محبت کا شکریہ ادا کیا۔ اسکے بعد فرمایا: اے لوگو! میرے والد کی حالت ایسی نہیں ہے کہ آپ ان سے ملاقات کر سکیں۔ والد صاحب نے آپ سے معذرت چاہی ہے اور فرمایا ہے کہ آپ سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں' چلے جایئے' یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرے لئے آپ سے ملاقات ممکن نہیں۔ لوگ چلے گئے۔ میں نے بھی بہت چاہا کہ میں بھی چلا جاؤں لیکن نہ جا سکا میرے قدموں میں جانے کی طاقت ہی نہیں رہی

تھی۔ میں کھڑا رہا۔ امام حسنؑ ایک مرتبہ پھر تشریف لائے۔ مجھے دیکھا اور کہا: اصبغ کیا تم نے نہیں سنا میں نے کیا کہا ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں آقا سنا ہے۔ فرمایا: پھر کیوں نہیں گئے؟ میں نے عرض کیا: میرا دل جانے کو تیار نہیں ہوتا' میرا دل چاہتا ہے کہ کسی طرح ایک مرتبہ پھر اپنے آقا کی زیارت کرلوں۔ امام تشریف لے گئے اور میرے لئے اجازت حاصل کر لائے۔ میں امیر المومنین کے سرہانے پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ امیر المومنین کے سر پر ایک زرد رومال باندھا گیا ہے۔ میں تعین نہیں کر پا رہا تھا کہ علی کا چہرۂ اقدس زیادہ زرد ہے یا وہ رومال۔

بعض نے کہا ہے کہ تلوار کی ضربت اور اس مسمومیت کے مقابل حضرت علی علیہ السلام کے بدن کی قوت مدافعت ایک غیر معمولی بات ہے۔ قاعدتاً علی کو ضربت لگتے ہی دنیا سے رخصت ہو جانا چاہئے تھا۔ ان آخری لمحات میں علی کبھی بے ہوش ہو جاتے کبھی ہوش میں آ جاتے۔ جب آپ ہوش میں آتے تو آپ کی زبانِ مقدس پر ذکرِ خدا اور وعظ و نصیحت جاری ہو جاتے۔ کیسے کیسے نصائح' کیسے کیسے مواعظ' کیسی کیسی باتیں۔

اب اس موقع پر علیؑ کی اولاد کے سوا کوئی علیؑ کے بستر کے نزدیک نہ تھا۔ ذکرِ مصیبت ہمارا یہی ایک جملہ ہے۔ علی کے بچے علی کے بستر کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ آقا کبھی باتیں کرنے لگتے ہیں اور کبھی بے

حال ہو جاتے ہیں۔ ہم نے ایک مرتبہ علیؑ کی آواز سنی جیسے آپ کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ فرشتوں کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں: اِرْفَقُوا مَلَائِكَةَ رَبّی بی. میرے خدا کے فرشتو! جو میری روح قبض کرنے کے لئے آئے ہو میرے ساتھ نرمی کا سلوک کرنا۔ ایک مرتبہ دیکھتے ہیں کہ علیؑ کی صدا بلند ہوئی: اَشْهَدُ اَنْ لا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لاشَرِيكَ لَـهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ اَلرَّفِيقُ الْاَعْلىٰ اَلرَّفِيقُ الْاَعْلىٰ: یہ علی کے کلمات تھے۔ میں خدا کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہوں، میں پیغمبر کی رسالت کی شہادت دیتا ہوں۔ {اسکے بعد} جان، جان آفرین کے سپرد کی اور علیؑ کے گھر سے نالا و شیون کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔(۱)

✿✿✿
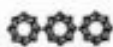
۱۔ تقریر کے آخری چند سیکنڈ کیسٹ پر ریکارڈ نہیں ہوئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عبادت ونماز

(۳)

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا ہ وَّسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلاً۔"(۱)

نماز کی اہمیت

ہم اپنے مذہبی مضامین میں بعض ایسی چیزیں بھی دیکھتے ہیں جو کچھ اذہان میں عبادت کے موضوع پر سوالات پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً نماز کے بارے میں ہم سے کہا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے یا ائمہ اطہار علیہم السلام (۲) کا فرمان ہے کہ: اَلصَّلوٰۃُ عمودُ الدّینِ (نماز دین کا ستون ہے۔ وسائل الشیعہ۔ ج۳۔ ص۲۳۔ ح۱۳)

ا۔ ایمان والو! کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا کرو اور صبح وشام اسکی تسبیح کیا کرو۔ (سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۴۱،۴۲)

۲۔ کیونکہ یہ چیز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلمات میں بھی پائی جاتی ہے اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے فرمودات میں بھی موجود ہے۔

یعنی اگر ہم دین کو ایک نصب شدہ خیمہ سمجھیں، جس میں اس کی چادر بھی ہے طناب بھی، حلقہ بھی، زمین میں گڑی ہوئی بڑی بڑی کیلیں بھی اور ایک ستون بھی جس نے اس خیمے کو کھڑا کیا ہوا ہے تو نماز اس نصب شدہ خیمے کے ستون کی مانند ہے۔ حدیث نبوی میں، جو خود رسول کریم سے نقل ہوئی ہے، خاص طور پر اسی بات کی بالکل اسی طرح وضاحت کی گئی ہے، جس طرح ہم نے آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے۔

نماز کے بارے میں روایت ہے: اِنَّ قُبِلَتْ قِبَلَ مَاسِوِیهَا وَاِنْ رُدَّتْ رُدَّ مَاسِوَاهَا. مراد یہ ہے کہ انسان کے تمام اعمال کی قبولیت نماز کے قبول ہونے سے مشروط ہے۔ یعنی اگر انسان کوئی نیک عمل انجام دے لیکن نماز نہ پڑھے، یا نماز پڑھے تو سہی لیکن درست نہ پڑھے، ایسی نماز پڑھے جو بارگاہِ الٰہی میں قبول نہ کی جائے، مسترد کر دی جائے، تو ایسی صورت میں اسکے دوسرے تمام نیک اعمال بھی مسترد کر دیے جائیں گے۔ انسان کے تمام نیک اعمال کی قبولیت اسکی نماز کی قبولیت سے وابستہ ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے: اَلصَّلٰوۃُ قُرْبَانُ کُلِّ تَقِی (نماز ہر متقی کے لئے وسیلۂ تقرب ہے۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۱۳۶)۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ شیطان اس وقت تک مومن سے دور اور اس سے ناراض رہتا ہے جب تک وہ اپنی نماز کی حفاظت اور پابندی کرتا ہے۔

احادیث و روایات میں کثرت کے ساتھ اس طرح کی باتیں ملتی ہیں' حتیٰ خود آیاتِ قرآنی سے اس مفہوم یعنی نماز کی غیر معمولی اہمیت کو اخذ کیا جا سکتا ہے۔

اس بارے میں اٹھنے والا ایک سوال جو گاہ بگاہ کچھ لوگوں کی زبان پر آتا ہے' وہ یہ ہے کہ نماز کی اہمیت کے بارے میں اس قدر زیادہ احادیث میں سے کچھ احادیث تو ضرور جعلی ہوں گی' درست نہ ہوں گی' صحیح اور معتبر نہ ہوں گی' پیغمبر یا ائمۂ اطہار کا کلام نہ ہوں گی؟ ان احادیث کو شاید اس دور میں وضع کیا گیا ہو گا جس میں عالم اسلام میں زاہد اور عبادت گزار افراد کی کثرت ہو گئی تھی' یہ اس دور کی ساختہ ہوں گی جب (اسلامی دنیا) میں زہد و عبادت کا بازار گرم تھا' بالخصوص دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جبکہ زاہد مسلک اور عبادت میں حد سے گزر جانے والے افراد ظاہر ہوئے تھے' جو کم و بیش رہبانیت اختیار کر چکے تھے۔

زاہد اور صوفی نما لوگ

ہم دیکھتے ہیں کہ جس وقت سے دنیائے اسلام میں تصوف نے جنم لیا' اسی دور سے ایسے افراد پیدا ہو گئے تھے جو دیگر اسلامی فرائض و واجبات کو بھلا کر اپنی ساری طاقتیں صرف عبادت اور نماز میں صرف کرتے تھے۔

مثلاً ہم حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں ربیع بن خثیم نامی ایک

شخص کو پاتے ہیں' یہ وہی معروف خواجہ ربیع ہیں جن سے منسوب ایک قبر مشہد مقدس میں ہے۔ اب میں یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ قبر انہی کی ہے یا نہیں' مجھے اس بارے میں خاطر خواہ معلومات نہیں۔ البتہ اس بارے میں شک نہیں کہ یہ "زھادِ ثمانیه" یعنی دنیائے اسلام کے آٹھ معروف زاہدوں میں سے ایک شمار کیے جاتے ہیں۔

ربیع بن خثیم کے زہد و عبادت کا یہ عالم تھا کہ اپنی عمر کے آخری دور میں(۱) انہوں نے اپنی قبر کھودی اور وقتاً فوقتاً جا کے اس قبر میں لیٹ جایا کرتے اور اپنے آپ کو وعظ و نصیحت کرتے۔ قبر میں لیٹ کر اپنے آپ سے کہتے کہ: یہ نہ بھلا بیٹھنا کہ آخرکار تمہیں یہیں آنا ہے۔

جب انہیں اطلاع ملی کہ لوگوں نے فرزندِ رسول حسین ابن علی علیہ السلام کو شہید کر دیا ہے تو انہوں نے اس اندوہناک واقعے پر اظہار افسوس کے طور پر صرف اتنا کہا کہ: "وائے ہو اس امت پر جس نے اپنے پیغمبر کے فرزند کو شہید کیا۔" اور یہ (اس بیس سال کے عرصے میں) ذکر الٰہی اور دعا و مناجات کے سوا ان کی زبان سے ادا ہونے والا واحد جملہ تھا۔ کہتے

۱۔ ربیع' حضرت علی علیہ السلام کے بعد امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے زمانے تک حیات رہے' یہ تقریباً ۲۰ سال پر محیط عرصہ ہے۔ یعنی جس زمانے میں امام حسین کو شہید کیا گیا' یہ زندہ تھے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ پورے ۲۰ سال ان کا کام فقط اور فقط عبادت تھا' اور اس عرصے میں انہوں نے کوئی دنیاوی بات زبان سے ادا نہ کی۔

ہیں کہ بعد میں انہوں نے استغفار کیا اور پشیمان ہوئے کہ آخریوں میں یہ چند کلمات زبان پر لایا جو ذکرِ خدا نہ تھے۔

یہی ربیع بن خثیم امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے دورِ خلافت میں حضرت کی سپاہ میں شامل تھے۔ ایک روز امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا اَمیرَ الْمُؤمِنِینَ اَنَا شَکَکْنَا فِی هٰذَا الْقِتَالِ (۱)۔ اے امیر المومنین! ہمیں اس جنگ کے بارے میں شک ہے۔ ہمیں خدشہ ہے کہ کہیں یہ جنگ غیر شرعی نہ ہو۔ (کیوں؟ کس وجہ سے؟) اس لئے کہ ہم اہل قبلہ (مسلمانوں) کے خلاف برسر پیکار ہیں' ہم ایسے لوگوں کے خلاف تلواریں اٹھائے ہوئے ہیں جو ہماری ہی مانند شہادتین (کلمہ) پڑھتے ہیں' ہماری ہی طرح نماز ادا کرتے ہیں' ہماری ہی مثل رو بہ قبلہ کھڑے ہوتے ہیں۔

ربیع' امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے شیعہ تھے اس لئے ان سے جدا بھی نہیں ہونا چاہتے تھے' لہٰذا کہتے ہیں: اے امیر المومنین! برائے کرم میرے سپرد کوئی ایسا کام کیجئے جو شک وشبہ سے پاک ہو۔ مجھے کسی ایسی جگہ' کسی ایسی ڈیوٹی پر بھیج دیجئے' جس میں شک نہ ہو۔

امیر المومنین نے جب ان کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا: بہت اچھا' اگر تم شک میں مبتلا ہو تو میں تمہیں ایک دوسری جگہ بھیج دیتا ہوں۔

۱۔ ان کے "انا" کہنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ کئی لوگوں کے نمائندے کی حیثیت سے آئے تھے۔

معلوم نہیں خود انہوں نے اس جگہ جانے کی درخواست کی یا خود امیر المومنین ہی نے فیصلہ کر کے انہیں مملکت اسلامی کی سرحدوں میں سے ایک سرحد پر بھیج دیا' وہاں بھی وہ سپاہی کی حیثیت سے تعینات تھے' لیکن یہ ایک ایسی سرحد تھی کہ اگر اتفاق سے وہاں جنگ اور خونریزی کی نوبت آتی بھی تو دوسری طرف کفار یا بت پرست ہوتے' غیر مسلم ہوتے۔

جی ہاں' یہ تھا اس زمانے کے زہاد اور عبادت گزار افراد کا ایک نمونہ۔

ایسا زہد وعبادت کس کام کا؟

کسی کام کا نہیں۔

ایک ایسا شخص جو حضرت علی علیہ السلام جیسی شخصیت کے لشکر میں شامل ہو۔ لیکن علی کی دکھائی ہوئی راہ' اور علی کے فرمانِ جہاد کے بارے میں شک و شبہے کا شکار ہو' یہ خیال اسکے ذہن میں آئے کہ آپ کا یہ فرمان' یہ حکم درست بھی ہے یا نہیں؟ اس موقع پر وہ احتیاط پر عمل کرے' احتیاط پر بنا رکھے۔ اسی طرح جیسے آج کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کیوں مشکوک روزہ رکھیں؟ آپ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان یہ بات بہت عام ہے' وہ کہتے ہیں کہ ہم کیوں ایسا روزہ رکھیں جس میں شک ہے' یہ بھی کوئی عمل ہوا؟ کیوں ایسی جگہ جنگ کریں جہاں شک ہو؟ ہمیں ایسی جگہ چلنا چاہئے جہاں رکھے جانے والے روزے میں شک نہ ہو

اس بات کی کیا اہمیت ہے؟

اسلام بصیرت کا تقاضا کرتا ہے۔ عمل بھی طلب کرتا ہے بصیرت بھی۔ یہ شخص (خواجہ ربیع) بصیرت کے حامل نہ تھے۔ انہوں نے معاویہ اور یزید جیسے ظالم کے دور میں زندگی بسر کی۔ دورِ معاویہ جس میں دین خدا میں تبدیلیاں کی گئیں' اس میں بدعتیں ایجاد کی گئیں۔ یزید جو تاریخ اسلام کے بھیانک ترین جرائم کا مرتکب ہوا' اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام تر کوششوں اور محنتوں پر پانی پھیر دینے کے درپے ہوا۔ لیکن ایسے دور میں یہ صاحب (خواجہ ربیع) گوشہ نشینی اختیار کر کے شب و روز مسلسل نماز میں مشغول رہتے ہیں' ذکرِ الٰہی کے سوا کوئی کلمہ ان کی زبان سے ادا نہیں ہوتا اور اگر حسین ابن علی علیہ السلام کی شہادت پر اظہارِ تاسف کے لئے ایک جملہ ان کی زبان سے نکل بھی جاتا ہے' تو بعد میں اپنے اس عمل پر پشیمان ہوتے ہیں' کہتے ہیں کہ یہ تو دنیوی بات ہو گئی' میں نے اس کی بجائے **سبحان اللہ' الحمد للہ'** کیوں نہ کہا؟ اسکی جگہ **یا حی یا قیوم** کیوں نہ کہا؟ **اللہ اکبر** اور **لا حول ولا قوۃ الا باللہ** کیوں نہ پڑھا؟

یہ طرزِ عمل اسلامی تعلیمات سے موافق نہیں۔ **لَا یُریٰ الْجَاهِلُ اِلَّا مُفْرِطًا اَوْ مُفَرِّطًا** (جاہل کو نہ پاؤ گے مگر یا حد سے بڑھا ہوا اور یا اس سے بہت پیچھے۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۷۶)۔ جاہل یا تو بہت آگے بڑھ جاتا ہے

یا بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

دین کے بارے میں ایک غلط تصور

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ: اَلصَّلوٰۃُ عَمُودُ الدِّین (نماز دین کا ستون ہے) والی بات کسی بھی طرح اسلامی تعلیمات سے موافق نہیں۔ کیونکہ دین اسلام تو سب چیزوں سے زیادہ اجتماعی مسائل کو اہمیت دیتا ہے۔ اسلام تو اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱) کا دین ہے۔ اسلام تو لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتَابَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۲) کا دین ہے۔ اسلام تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دین ہے: کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (۳) اسلام جہدِ مسلسل اور کوشش اور عمل کا دین ہے۔ اسلام ایک عظیم دین ہے۔

ایک ایسا دین جو مذکورہ مسائل کو اتنی اہمیت دیتا ہے، کیسے ممکن ہے کہ وہ عبادت کے لئے اتنی زیادہ اہمیت کا قائل ہو؟ نہیں، دین اسلام میں عبادت

۱۔ بے شک اللہ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔ (سورۂ نحل ۱۶- آیت ۹۰)

۲۔ بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔ (سورۂ حدید ۵۷- آیت ۲۵)

۳۔ تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے۔ تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو۔ (سورۂ آل عمران ۳- آیت ۱۱۰)

کے مسئلے کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔ہمیں اسلام کی اخلاقی اور اجتماعی تعلیمات کے نفاذ کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔عبادت بے کار لوگوں کا مشغلہ ہے۔جنہیں کوئی اہم ترین کام نہ ہو وہ نماز پڑھیں' وہ عبادت کریں۔لیکن ایک ایسا شخص جس کے سامنے اہم ترین کام ہوں اسکے لئے لازم نہیں کہ وہ عبادت بجالائے۔

یہ بھی ایک غلط فکر ہے اور انتہائی انتہائی خطرناک۔اسلام کو اس طرح سمجھنا چاہئے' جیسا کہ وہ ہے۔

میرے ان عرائض کی وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کو میں اپنے معاشرے میں ایک بیماری کی صورت میں محسوس کر رہا ہوں۔انتہائی افسوس کی بات ہے کہ اس وقت ہمارے معاشرے میں جو لوگ اسلام کا نعرہ بلند کر رہے ہیں ان میں سے اکثر (البتہ سب کو نہیں کہتا) دو گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ایک گروہ ربیع بن خثیم جیسے طرز فکر کا حامل ہے' خواجہ ربیع کی طرح سوچتا ہے۔ایسے لوگوں کے نزدیک "اسلام" ذکر و دعا کرنے' نوافل پڑھ لینے' زیارات پر جانے اور زیارتِ عاشورہ کی قرآئت کا نام ہے۔ایسے افراد کے نزدیک اسلام کے معنی مفاتیح اور زاد المعاد ہے (دعاؤں کی دو معروف کتابیں)۔ان کا پورا کا پورا اسلام مفاتیح الجنان میں سمٹ آیا ہے۔اسکے سوا ان کے نزدیک کسی اور چیز کا وجود ہی نہیں' یہ لوگ بالکل ربیع بن خثیم کی سی سوچ رکھتے ہیں۔انہیں دنیا سے

کوئی سروکار ہی نہیں' مسائل حیات سے کوئی غرض ہی نہیں' اسلام کی اجتماعی تعلیمات سے کوئی مطلب نہیں' اسلامی اصول و ارکان سے کوئی لگاؤ نہیں' اسلامی تربیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ انہیں سرے سے کسی بھی چیز سے مطلب نہیں۔

ان لوگوں کی تفریط کے ردِعمل میں ایک افراطی طبقہ پیدا ہوا ہے۔ یہ طبقہ اسلام کے اجتماعی مسائل کو اہمیت دیتا ہے' ان کے بارے میں حساسیت کا اظہار بھی کرتا ہے۔ اس پہلو سے یہ لوگ قابل قدر ہیں۔ لیکن انہی لوگوں میں سے کچھ کو بعض اوقات میں دیکھتا ہوں کہ مثلاً مستطیع ہونے کے باوجود حج کو نہیں جاتے۔ یہ شخص جو واقعاً مسلمانوں سے' حقیقتاً اسلام سے لگاؤ رکھتا ہے' اس کا دل اسلام کے لئے دھڑکتا ہے' لیکن مستطیع ہوتے ہوئے بھی حج کو نہیں جاتا' اس کی نظر میں حج کی کوئی اہمیت ہی نہیں' تقلید ضروری ہے لیکن اسے اہمیت نہیں دیتا۔ حالانکہ تقلید ایک معقول بات ہے۔

تقلید کسے کہتے ہیں؟

کہا جاتا ہے کہ یا تو آپ' نماز روزہ جیسی چیزوں کے مسائل کو (مصادر شرع سے) براہ راست خود اخذ کیجئے۔ یعنی اس میدان میں اس قدر ماہر ہو جایئے کہ اس مہارت کے بل بوتے پر خود استنباط کر سکیں۔ یا پھر یہ کہ احتیاط پر عمل کیجئے' جو ایک خاصا دشوار کام ہے۔ یا پھر ایک ماہر جامع الشرائط عادل شخص

کا انتخاب کیجئے اور جس طرح ایک ماہر طبیب سے رجوع کر کے اسکے بتائے ہوئے پر عمل کرتے ہیں اسی طرح اس کی رائے پر عمل کیجئے۔ انسان بغیر تقلید کے رہ ہی نہیں سکتا۔ یعنی اگر وہ تقلید نہ کرے تو اپنے آپ کو بہت زیادہ مشکل میں ڈال لیتا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ روزے کو اہمیت نہیں دیتے۔ اگر کسی سفر کی وجہ سے ان کا روزہ قضا ہو جائے تو اس قضا کو ادا نہیں کرتے۔ یہ لوگ بھی اپنے آپ کو ایک کامل مسلمان سمجھتے ہیں۔ وہ اوّل الذکر گروہ بھی خود کو کامل مسلمان سمجھتا ہے ' جبکہ نہ یہ کامل مسلمان ہیں نہ وہ۔

دین اسلام نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ (۱) سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان اسلامی عبادات کو تو اپنائے لیکن اسکے معاشرتی اور اخلاقی قوانین کو نہ لے ' اسکے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اختیار نہ کرے۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو لے لے اور اسلامی عبادات کو چھوڑ دے۔

قرآن مجید جہاں کہیں بھی اقیمو الصلاۃ کہتا ہے' اسکے فوراً بعد آتو الزکاۃ کہتا ہے۔ اگر اقام الصلاۃ کہتا ہے تو اسکے بعد آتی الزکاۃ کہتا ہے۔ جب یقیمون الصلاۃ کہتا ہے تو اسکے بعد یوتون الزکاۃ کہتا ہے۔

۱۔ ہم بعض چیزوں پر ایمان لائیں گے اور بعض چیزوں کا انکار کریں گے۔ (سورۂ نساء ۴- آیت ۱۵۰)

یقیمون الصلاۃ کا تعلق بندے اور خدا کے درمیان رشتے سے اور یوتون الزکاۃ کا ربط بندگانِ خدا کے آپس کے تعلقات سے ہے۔

جس طرح ایک مردِ مسلمان کو اپنے اور اپنے رب کے درمیان ایک مستقل اور مسلسل رابطے کی ضرورت ہے اسی طرح اسکے لئے ضروری ہے کہ اپنے اور اپنے معاشرے کے درمیان بھی ایک مستقل اور مسلسل رابطہ قائم رکھے۔

نماز کے بغیر روزے کے ایک اسلامی معاشرہ تشکیل نہیں پا سکتا حتیٰ خود انسان بھی سالم نہیں رہ سکتا۔

بغیر عبادت کے بغیر ذکرِ الٰہی کے بغیر یادِ خدا کے بغیر مناجات کے بغیر حضورِ قلب کے بغیر

اسی طرح بغیر ایک سالم معاشرے کے بغیر ایک سالم ماحول کے بغیر امر بالمعروف کے بغیر نہی عن المنکر کے بغیر مسلمانوں سے پیار و محبت کے اور بغیر دوسروں کی مدد اور ان کے ساتھ تعاون کے انسان ایک اچھا عبادت گزار بندہ نہیں بن سکتا۔

علی ایک جامع الصفات ہستی

آپ اگر حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی حیات پر ایک سرسری سی نگاہ بھی ڈالیں تو پتا چل جاتا ہے کہ آپ ایک عابد بلکہ دنیا کے اوّلین درجے

کے عابد ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کی عبادت تمام عالم میں ضرب المثل بن جاتی ہے۔ عبادت بھی ایسی کہ فقط خم و راست ہونا نہیں (بے روح رکوع و سجود نہیں) بلکہ ایسی عبادت جو اوّل سے آخر تک جذبات سے' ولولے سے' عشق سے' گریہ وزاری سے لبریز ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد ''ضرار'' نامی ایک شخص کی معاویہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاویہ کو معلوم تھا کہ ''ضرار'' حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے ہیں۔ چنانچہ فرمائش کی: تم علی کے ساتھ ہوا کرتے تھے' میرے سامنے ان کے فضائل بیان کرو۔ خود معاویہ اچھی طرح حضرت علی سے واقف تھے۔ لیکن اسکے باوجود وہ دوسروں سے ان کے بارے میں سننا پسند کرتے تھے کیونکہ وہ دل کی گہرائیوں سے حضرت علی کی عظمت کے قائل تھے' حالانکہ یہی تھے جنہوں نے حضرت علی کے خلاف تلوار تک اٹھائی تھی۔

انسان ایسا ہی موجود ہے!! وہ علی کے عقیدتمند بھی تھے' لیکن اس کے باوجود انہوں نے حضرت علی کے خلاف ناپسندیدہ اقدامات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

''ضرار'' نے معاویہ کے سامنے اپنا ایک مشاہدہ نقل کیا۔ کہا: میں نے ایک رات علی کو محرابِ عبادت میں دیکھا: **يَتَمَلْمَلَ تَمَلْمُلَ السَّلِيمِ وَيَبْكِي بُكَاءَ الْحَزِينِ** ۔ یعنی آپ محرابِ عبادت میں خوفِ خدا سے' ایک ایسے شخص کی

مانند تڑپ رہے تھے جسے سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے ایک انسان کی مانند گریہ وزاری میں مشغول تھے' سرد آہیں بھرتے تھے' آتش جہنم سے لرزاں آہ آہ کرتے تھے۔ مولائے کائنات کی یہ کیفیت سن کر معاویہ کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔

اسی طرح جب حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد ایک موقع پر معاویہ اور عدی بن حاتم کی ملاقات ہوئی تو معاویہ نے عدی بن حاتم کو حضرت علی کے خلاف بھڑکانا چاہا۔ عدی سے کہا: این الطرفات ؟ طریف' طرفہ اور طارف کیا ہوئے؟(۱)

حضرت عدی بن حاتم نے جواب دیا: وہ سب صفین میں علی کی رکاب میں شہید ہو گئے۔

معاویہ نے کہا: علی نے تیرے ساتھ ناانصافی کی' اپنے بچوں حسن اور حسین کو تو پیچھے رکھا اور تیرے بچوں کو آگے کر کے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔

حضرت عدی بن حاتم نے جواب دیا: حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے علی

۱۔ حضرت عدی بن حاتم کے تین فرزند تھے' جن کے نام طریف' طرفہ اور طارف تھے۔ ان کے ان تینوں فرزندوں نے حضرت علی علیہ السلام کی رکاب میں جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا تھا۔ معاویہ عدی بن حاتم کے جذبات بھڑکانا چاہتے تھے۔ لہٰذا ان کے زخموں پر نمک پاشی کی تاکہ ان کے منہ سے حضرت علی کے خلاف ایک لفظ ہی نکلوا سکیں۔

کے ساتھ ناانصافی کی۔ اگر میں انصاف کرتا تو آج میں زندہ اور علی زیرِ خاک نہ ہوتے۔

معاویہ نے جب اپنا نشانہ خطا جاتے دیکھا تو عدی سے کہا: اے عدی! میرا دل چاہتا ہے کہ تم مجھے علی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ عدی بن حاتم نے تفصیل کے ساتھ حضرت علی کے اوصاف بیان کئے۔ وہ کہتے ہیں کہ آخر میں میں نے دیکھا کہ معاویہ زار و قطار رو رہے ہیں۔ اسکے بعد انہوں نے آستین سے اپنے آنسو صاف کئے اور کہا: افسوس کہ زمانہ علی کی مانند انسان جننے سے بانجھ ہے۔

دیکھئے حقیقت کیسے جلوہ گر ہوتی ہے؟

یہ تو تھی حضرت علی علیہ السلام کی عبادت' لیکن کیا علی صرف اہل محراب تھے' محراب کے سوا کہیں اور نظر نہ آتے تھے؟

ہم حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے ایک اور رخ کا جائزہ لیتے ہیں (اور وہ آپ کی حیاتِ اجتماعی سے تعلق رکھتا ہے) آپ ہر لحاظ سے ایک اجتماعی ترین فرد تھے' ضرورت مندوں' بے کسوں' مسکینوں اور لاچاروں کے حالات سے واقف ترین فرد تھے۔ خلیفہ ہونے کے باوجود آپ دن کے وقت اپنا درہ یعنی کوڑا کاندھے پر لٹکائے' بنفس نفیس لوگوں کے درمیان گشت فرماتے تھے۔ ان کے معاملات کا جائزہ لیتے تھے۔ جب تاجروں کے پاس پہنچتے تو فرماتے:

اَلْفِقْهُ ثُمَّ الْمَتْجَر (۱)۔ جاؤ پہلے تجارت کے مسائل سیکھو اسکے شرعی احکام کی تعلیم حاصل کرو اسکے بعد آ کے تجارت کرنا۔ حرام خرید وفروخت نہ کرو سودی معاملہ نہ کرو۔

اگر کسی کو تاخیر سے اپنے کام پر جاتے دیکھتے تو فرماتے۔ اُغْدُوا اِلٰی عِزِّکُم۔

ایک انتہائی عبادت گزار فرد ہونے کے ساتھ ساتھ آپ میں یہ خصوصیت بھی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے مذکورہ حدیث مرحوم آیت اللہ العظمٰی بروجردی علیہ الرحمہ کی زبانی سنی تھی۔ ایک مرتبہ ایک گداگر' آقائے بروجردی کے یہاں آ کے ان کے سر ہو گیا' اور کچھ طلب کرنے لگا۔ انہوں نے اس پر نگاہ ڈالی' دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ شخص محنت مزدوری کر سکتا ہے لیکن گداگری کو اس نے اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ لہٰذا انہوں نے اسے نصیحت کی اور بہت سی دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ حضرت علی علیہ السلام کا یہ جملہ بھی فرمایا: کہا کہ امیر المومنین لوگوں سے فرماتے تھے: اُغْدُوا اِلٰی عِزِّکُمْ (۲) علی الصبح اپنی عزت و شرف کی طرف روانہ ہوا کرو۔ یعنی اپنے کام' محنت مزدوری اور حصول روزگار کی طرف جایا کرو۔ انسان اس وقت عزیز و سر بلند ہے جب وہ خود کماتا ہو' اپنی معاش کا بندوبست خود کرتا ہو۔ محنت مزدوری عزت ہے'

۱۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۲۔ ص ۲۸۲۔ ح ۱۔   ۲۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۲۔ ص ۱۲۔ ح ۱۰۔

شرافت ہے۔

اسے کہتے ہیں حقیقی مثالی مسلمان۔

آپ عبادت کے میدان میں سرفہرست عبادت گزار ہیں۔ جب قضاوت کی مسند پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو ایک عادل قاضی ہیں ذرہ برابر بے انصافی نہیں کرتے۔ جب میدانِ جنگ کا رخ کرتے ہیں تو ایک بہادر سپاہی اور شجاع سپاہ سالار ہیں ایک اول درجے کے کمانڈر ہیں خود فرماتے ہیں: میں نے ابتدائے شباب ہی سے جنگ کی ہے جنگ کا تجربہ رکھتا ہوں۔ اور جب آپ خطابت کی کرسی پر تشریف فرما ہوتے ہیں تو اوّل درجے کے خطیب ہیں۔ جب تدریس کی ذمے داری سنبھالتے ہیں تو اوّل درجے کے معلم و مدرس ہیں۔

ہر ایک فضیلت میں آپ کا یہی حال ہے۔ یہ ہیں اسلام کا نمونۂ کامل۔

اسلام کسی صورت نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ کو قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم اسلام کے اس ایک پہلو کو تو مانیں گے لیکن اس کے اس دوسرے پہلو کا انکار کریں گے۔ دنیائے اسلام میں پیدا ہونے والے انحراف کا نقطۂ آغاز یہی ہے۔ اگر ہم اسلام کے کسی ایک پہلو کو لے لیں لیکن اسکے دوسرے پہلوؤں کو چھوڑ دیں تو اس طرح ہر چیز میں خرابی اور بگاڑ پیدا کر بیٹھیں گے۔

جس طرح گزشتہ ادوار میں ہمارے بہت سے زاہد پیشہ افراد کی روش غلط تھی' ایسے لوگوں کی روش غلط تھی جو پورے اسلام کو مثلاً مفاتیح الجنان میں منحصر سمجھتے ہیں' (دعاؤں کی ایک کتاب) بیاض میں محدود کر دیتے ہیں' اسی طرح ایسے لوگوں کی روش بھی غلط ہے جو دعا' عبادت' نوافل اور فرائض کو یکسر چھوڑ بیٹھتے ہیں اور اسلام کے صرف اجتماعی مسائل کے بارے میں توجہ چاہتے ہیں۔

مردِ مسلمان کی بعض نمایاں صفات

سورۂ مبارکہ "انا فتحنا" میں ارشاد الٰہی ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لیے سخت ترین اور آپس میں انتہائی مہربان ہیں۔ سورۂ فتح ۴۸- آیت ۲۹)

اس آیت میں ایک اسلامی معاشرے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ سب سے پہلے جس مسئلے کا ذکر کیا گیا ہے وہ پیغمبر کی معیت اور ان پر ایمان ہے' اسکے بعد اشداء علی الکفار یعنی بیگانوں کے مقابلے میں سخت ترین' قوی اور طاقتور ہونے کا ذکر ہے۔

پس وہ خشک مقدس نما لوگ جو مسجد میں ڈیرہ جمائے رہتے ہیں' ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود صرف ایک سپاہی کی للکار پر دم سادھ لیتے ہیں

اور چوں بھی نہیں کرتے' وہ مسلمان نہیں۔

قرآن کریم نے مسلمان کی ایک خصوصیت' بلکہ اولین خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ وہ دشمن کے بالمقابل سخت' پائیدار اور ثابت قدم ہوتا ہے۔ اسلام ست اور کمزور مسلمان کو پسند نہیں کرتا: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (خبردار سستی نہ کرنا مصائب پر محزون نہ ہونا' اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو سربلندی تمہارے ہی لئے ہے۔ سورۂ آل عمران ۳- آیت ۱۳۹)۔

اسلام میں سستی اور کمزوری کی کوئی گنجائش نہیں۔ ویل ڈیورنٹ کتاب ''تاریخ تمدن'' میں کہتا ہے: کسی اور دین نے اپنے ماننے والوں کو قوت و طاقت کے حصول کی ایسی دعوت نہیں دی' جتنی اس سلسلے میں اسلام نے دعوت دی ہے۔۔

گردن ڈالے رکھنا' گوشہ لب سے رال ٹپکنا' گریبان (collar) کا ایک طرف ڈھلکا ہونا' اسکا گندہ ہونا' خود کو غریب ولاچار ظاہر کرنا' زمین پر پیر گھسیٹ کر چلنا' عبا سر پر ڈال لینا' یہ سب چیزیں اسلامی تعلیمات کے برعکس ہیں۔ یوں ہی بلاوجہ آہیں بھرنا اسلام کے خلاف ہے۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کو مسلسل بیان کرتے رہنا۔ سورۂ ضحٰی ۹۳- آیت ۱۱)

خدا نے آپ کو صحت دی ہے' جسمانی سلامتی دی ہے' قوت عطا کی ہے' طاقت وتوانائی سے نوازا ہے۔ آپ اپنی کمر سیدھی رکھ سکتے ہیں تو کیوں بلاوجہ اسے جھکاتے ہیں؟ آپ اپنی گردن سیدھی رکھ سکتے ہیں' کیوں بغیر کسی وجہ کے اسے ایک جانب لٹکائے رکھتے ہیں؟ کیوں بے وجہ آہ و نالہ بلند کرتے ہیں؟ آہ و نالہ تو انسان تکلیف کی حالت میں بلند کرتا ہے۔ خدا نے آپ کو کسی درد اور تکلیف میں مبتلا نہیں کیا ہے' تو پھر کیوں آپ آہیں بھرتے ہیں؟ یہ تو نعماتِ الٰہی کا کفران ہے۔ کیا حضرت علی علیہ السلام بھی اسی طرح راستہ چلتے تھے جیسے ہم اور آپ چلتے ہیں؟ کیا علی اسی طرح عبا سر پر ڈالتے تھے اور اسی طرح ٹیڑھے ٹیڑھے چلتے ہوئے راستہ طے کرتے تھے؟(۱)۔ ان چیزوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

اشداء علی الکفار یعنی بے گانوں کے مقابل سخت ترین' پکے اور مضبوط' جیسے سدِ سکندری۔

(ایک مردِ مسلم کو) حلقۂ یاراں میں' مسلمانوں کے ساتھ' کس طرح ہونا چاہیے؟ رحماء بینھم یعنی آپس میں مہربان' گہرے دوست (ایک دوسرے کے ساتھ ریشم کی طرح نرم ہونا چاہیے)۔

(اسکے برخلاف) جب ہم اپنے بعض مقدس نما لوگوں سے ملتے ہیں' ان

۱۔ شہید مطہری نے ان سطور میں اپنے دور کے بعض علما نما افراد کی تصویر کشی کی ہے (مترجم)

کے یہاں جاتے ہیں تو جو چیز ہمیں ان میں نظر نہیں آتی وہ یہی اخلاص اور مہربانی ہے۔ ہمیشہ ان کی تیوریوں پر بل پڑے رہتے ہیں' بداخلاق اور ترش رو ہیں۔ کسی کے ساتھ گرم جوشی سے پیش نہیں آتے' کسی سے ہنس کے نہیں ملتے' دنیا کے ہر انسان پر احسان رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ مسلمان نہیں' یہ لوگ خود کو اسلام سے وابستہ ظاہر کرتے ہیں۔

یہ تھی (ایک مسلمان میں پائی جانے والی) دوسری خصوصیت۔

کیا یہی کافی ہے؟

کیا مسلمان ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ انسان کفار کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اہل اسلام سے مہربانی اور پیار و محبت کا برتاؤ کرے؟

۔۔۔۔۔۔جی نہیں۔ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (تم انہیں دیکھو گے کہ بارگاہِ احدیت میں سر جھکائے ہوئے سجدہ ریز ہیں اور اپنے پروردگار سے فضل و کرم اور اسکی خوشنودی کے طلبگار ہیں۔ سورہ فتح ۴۸۔ آیت ۲۹)

وہ شخص جو بے گانوں کیلئے سخت دل اور اپنوں کے لئے مشفق و مہربان ہے' اسی فرد کو جب محرابِ عبادت میں دیکھو گے تو رکوع و سجود' دعا و عبادت اور مناجات میں مشغول پاؤ گے۔ رکعاً و سجداً اسکی عبادت ہے' یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا اسکی دعا ہے۔

البتہ ہم دعا اور عبادت کے درمیان حد بندی کے قائل نہیں ہیں۔ دعا عبادت ہے اور عبادت بھی دعا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک عمل فقط اور فقط خالص دعا ہوتا ہے۔ یعنی ایک ایسی عبادت ہوتی ہے جو صرف دعا پر مشتمل ہے۔ لیکن کچھ عبادات ایسی ہیں جن میں دعا اور دعا کے علاوہ دوسری چیزیں بھی پائی جاتی ہیں، جیسے نماز۔ اسی طرح اور عبادات ہیں جو بنیادی طور پر دعا نہیں، جیسے روزہ۔

سِيمَا هُمْ فِيْ وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُوْدِ (سجدوں کی کثرت کی وجہ سے ان کے چہروں پر نشان پائے جاتے ہیں)۔ یہ لوگ اتنے زیادہ عبادت گزار ہیں کہ عبادت کے آثار، تقویٰ کے آثار، خدا پرستی کے آثار ان کے چہروں سے عیاں ہیں۔ ان کو دیکھنے والا ہر شخص ان کے وجود میں خدا کی معرفت اور خدا کی یاد کا نظارہ کرتا ہے، اور انہیں دیکھ کر یادِ خدا میں ڈوب جاتا ہے۔

شاید رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے منقول ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے ان سے سوال کیا: يا روح الله! مَنْ نُجَالِسُ؟ (اے روح اللہ! ہم کس قسم کے لوگوں کے ساتھ میل جول رکھیں؟)۔ حضرت عیسیٰ نے فرمایا: مَنْ يُذَكِّرُكُمُ اللهَ رُؤْيَتُهُ وَيَزِيدُ فِي عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهُ وَيُرَغِّبُكُمْ فِي الْخَيْرِ عَمَلُهُ. (۱) (ایسے شخص کے ساتھ

۱۔ اصول کافی۔ ج ۳۔ کتاب فضل العالم، باب مجالسۃ العلماء وصحبتھم۔

میل جول رکھو جسے دیکھ کر خدا کی یاد میں ڈوب جاؤ) اکی شکل وصورت پر اسکے چہرے مہرے پر خدا ترسی کو دیکھو۔ علاوہ ازایں یزید فی علمکم منطقہ (جب وہ بات کرے تو اسکی باتوں سے استفادہ کرو اکی گفتگو تمہارے علم میں اضافہ کرے) یرغبکم فی الخیر عملہ (اسکا کردار دیکھ کر تمہارے اندر بھی نیک کاموں کا شوق پیدا ہو)

آگے چل کر آیت کہتی ہے

ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَ مَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّارَ (یہی ان کی مثال توریت میں ہے اور یہی ان کی صفت انجیل میں ہے۔ جیسے کوئی کھیتی ہو جو پہلے سوئی نکالے پھر اسے مضبوط بنائے پھر وہ موٹی ہو جائے اور پھر اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے کہ کاشتکاروں کو خوش کرنے لگے تا کہ ان کے ذریعے کفار کو جلایا جائے۔ سورۂ فتح ۴۸ - آیت ۲۹)

توریت وانجیل میں ان کی یہی صفت بیان کی گئی ہے ایک ایسی ملت کے وجود میں آنے کی بات کی گئی ہے۔ ان کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے اس انداز میں توصیف کی گئی ہے۔ ان کی مثال ایک زراعت کی مثال ہے گندم کے ایک دانے کی مانند ہیں جسے زمین میں بویا جاتا ہے اور کیونکہ یہ دانہ زندہ ہوتا ہے اس لئے ایک باریک پتی کی صورت میں اپنا سر زمین سے باہر نکالتا ہے

اور پھر آہستہ آہستہ وہ ایک سخت پتے کی صورت اختیار کر لیتا ہے' اس میں مضبوطی اور استحکام آ جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک موٹی ڈالی بن جاتا ہے۔ اسکے بعد خود اپنے قدموں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ابتدا میں وہ زمین پر پڑا ہوا ایک معمولی سا پتا تھا' جسے ثبات و استحکام حاصل نہ تھا۔ بعد میں یہ ایسا پھلتا پھولتا ہے کہ انسان شناسی کے تمام ماہرین کو حیرت زدہ کر دیتا ہے اور وہ فکر میں ڈوب جاتے ہیں کہ یہ کیسی پختہ اور شاندار قوم وجود میں آئی ہے۔ البتہ حیرت و استعجاب کا باعث ایسی ہی قوم ہو سکتی ہے جو اشداء علی الکفار بھی ہو' رحماء بینھم بھی ہو اور رکعاً سجداً اور یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا بھی ہو۔ اس میں یہ تمام صفات پائی جاتی ہوں۔

اب بتائیے ہم مسلمان اس قدر زوال و انحطاط کا شکار کیوں ہیں؟ اس قدر بد بخت اور ذلیل و خوار کیوں ہیں؟ بتائیے ان مذکورہ خصوصیات میں سے کونسی خصوصیت ہمارے اندر موجود ہے؟ اور ہم کیا توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں؟

معنویات کو خفیف نہ سمجھئے

ہمیں صد در صد اعتراف ہے کہ اسلام ایک اجتماعی دین ہے' اسکے احکام و فرامین اسکے اجتماعی ہونے کے عکاس ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اس بات کا سبب نہیں ہو سکتی کہ ہم عبادت' دعا اور خدا سے ارتباط کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے

لگیں انہیں معمولی سمجھنے لگیں' نماز کو بے اہمیت سمجھیں۔

نماز کو خفیف اور معمولی سمجھنا بھی ایک گناہ ہے۔ نماز نہ پڑھنا ایک بڑا گناہ ہے لیکن نماز پڑھنا مگر اسے خفیف سمجھنا' اسے بے اہمیت قرار دینا بھی ایک گناہ ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات کے بعد (آپ کے ایک صحابی) ابو بصیر تعزیت کی غرض سے ام حمیدہ کے یہاں حاضر ہوئے۔ ام حمیدہ رونے لگیں۔ ابو بصیر' جو نابینا تھے وہ بھی رونے لگے۔ اسکے بعد ام حمیدہ نے ابو بصیر سے کہا: اے ابو بصیر! تم نہ تھے' تم نے اپنے امام کے آخر لمحات کو نہ دیکھا' اس وقت ایک عجیب قصہ ہوا۔ امام قریب قریب عالم غشی میں تھے' اسی اثنا میں آپ نے اپنی آنکھوں کو کھولا اور فرمایا: میرے تمام نزدیکی رشتے داروں کو بلاؤ' سب کو میرے سرہانے جمع کرو۔ ہم نے امام کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سب لوگوں کو اکھٹا کیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو امام نے اسی عالم غشی میں' جبکہ آپ اپنی حیاتِ مبارک کے آخری لمحات طے کر رہے تھے' اپنی آنکھوں کو کھولا' ارد گرد جمع ہونے والوں کی طرف رخ کیا اور صرف ایک جملہ ارشاد فرمایا: إِنَّ شَفَاعَتَنَا لاٰ تَنَالُ مُسْتَخِفًّا بِالصَّلٰوةِ (ہماری شفاعت کسی بھی صورت میں ان لوگوں کو نہ ملے گی جو نماز کو معمولی سمجھتے ہیں۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۳۔ ص ۱۷۔ ح ۱۱) امام نے صرف اتنا کہا اور جان' جان آفرین کے سپرد کر

دی۔

امام نے یہ نہیں فرمایا کہ ہماری شفاعت ان لوگوں کو نہ ملے گی جو نماز نہیں پڑھتے۔ ان لوگوں کا معاملہ تو بالکل واضح (clear) ہے۔ بلکہ فرمایا کہ ایسے لوگ جو نماز کو سبک اور معمولی سمجھتے ہیں وہ ہماری شفاعت نہ پاسکیں گے۔

کون لوگ ہیں جو نماز کو سبک اور معمولی سمجھتے ہیں؟

نماز کو معمولی چیز اور بے اہمیت سمجھنے والے لوگ وہ ہیں جنہیں وقت اور فرصت میسر ہوتی ہے وہ اطمینان کے ساتھ ایک اچھے طریقے سے نماز پڑھ سکتے ہیں لیکن ایسا نہیں کرتے۔ ظہر عصر کی نماز اس وقت پڑھتے ہیں جب سورج غروب ہونے کو ہوتا ہے۔ جب دیکھتے ہیں کہ سورج ڈوبنے کو ہے تو بھاگم بھاگ وضو کرتے ہیں جھٹ پٹ نماز پڑھتے ہیں اور تیزی کے ساتھ سجدہ گاہ ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسی نماز پڑھتے ہیں جس کا نہ مقدمہ ہوتا ہے نہ موخرہ نہ جس میں اطمیان ہوتا ہے نہ حضور قلب۔ ایسا طرز عمل اختیار کرتے ہیں جیسے نماز بھی دوسرے معمولی کاموں کی طرح کا ایک کام ہے۔

یہ ہے نماز کو خفیف سمجھنا۔ ایسی نماز اس نماز سے بہت زیادہ مختلف ہے جس کی طرف انسان ذوق وشوق کے ساتھ جاتا ہے۔ جوں ہی ظہر کا اول وقت آتا ہے وہ مکمل اطمینان کے ساتھ جا کر وضو کرتا ہے ایسا وضو جس میں تمام آداب کو ملحوظ رکھا گیا ہوتا ہے۔ اسکے بعد جانماز پر آ کر اذان واقامت کہتا ہے

اور سکون اور دل جمعی کے ساتھ نماز پڑھتا ہے۔ سلام کہہ کر فوراً ہی کھڑا نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اطمینانِ قلب کے ساتھ کچھ دیر تعقیباتِ نماز پڑھتا ہے' ذکرِ خدا کرتا ہے۔۔۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ (اس گھر میں) اس کی نظر میں نماز کو احترام حاصل ہے۔

ایسے نمازی جو نماز کو خفیف قرار دیتے ہیں' یعنی حقیر اور معمولی سمجھتے ہیں' وہ فجر کی نماز عین طلوعِ آفتاب کے وقت پڑھتے ہیں اور ظہر و عصر کی نماز غروبِ آفتاب کے وقت ادا کرتے ہیں' مغرب اور عشاء کی نماز انہیں رات کے چار گھنٹے گزر جانے کے بعد یاد آتی ہے۔ یہ لوگ برق رفتاری اور تیزی کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ایسے لوگوں کے بچے سرے سے نماز پڑھتے ہی نہیں۔

آپ اگر حقیقی نماز گزار بننا چاہتے ہیں' اور یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے بھی نماز کے پابند بنیں تو آپ کو نماز کا احترام کرنا چاہئے۔ ہم آپ سے صرف یہ تقاضا نہیں کر رہے کہ نماز پڑھئے' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ چاہتے ہیں کہ نماز کا احترام کیجئے۔ اس مقصد کیلئے پہلے تو خود اپنے لئے گھر میں نماز پڑھنے کی ایک مخصوص جگہ بنائیے (یہ مستحب بھی ہے)۔ یعنی گھر میں ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیجئے جو آپ کی عبادت گاہ ہو' مصلا نما ایک چیز اپنے لئے بنائیے۔

جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کے لئے ایک جگہ معین کی

ہوئی تھی اگر ممکن ہو تو آپ بھی ایک کمرے کو نماز پڑھنے کی جگہ کے طور پر مقرر کر لیجیے۔ اگر گھر میں کمرے زیادہ نہ ہوں تو خود اپنے کمرے میں نماز کے لئے ایک خاص جگہ معین کر لیجیے۔ ایک پاک صاف جانماز وہاں رکھئے' نماز کے لئے کھڑے ہونے سے قبل اسے بچھایئے۔ آپ کے پاس ایک مسواک بھی ہو' ذکر پڑھنے کے لئے تسبیح بھی ہو۔

جب وضو کر رہے ہوں تو اسے بھی جلدی جلدی اور عجلت میں نہ کیجئے۔ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم حضرت علی کے شیعہ ہیں۔ برادرِ عزیز! نام رکھ لینے سے علی کا شیعہ نہیں ہوا جا سکتا' جس شخص نے حضرت علی کے وضو کو بیان کیا ہے وہ کہتا ہے: علی ابن ابی طالب جب وضو کے لئے تشریف لاتے اور ہاتھوں کو پانی میں ڈالتے (وضو کا پہلا مستحب عمل یہ ہے کہ انسان اپنے دونوں ہاتھوں کو دھوئے) تو فرماتے: بِسْمِ اللهِ وَ بِاللهِ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ (اللہ کے نام اور اللہ ہی کے سہارے سے۔ خدایا! مجھے توبہ کرنے والوں میں قرار دے' مجھے پاکیزہ رہنے والوں میں قرار دے)

دو دن پہلے ہم نے توبہ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ توبہ کے معنی خود کو پاکیزہ کرنا ہیں۔ پانی رمز طہارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب علی پانی کا رخ کرتے ہیں تو' توبہ کو یاد کر کے' اپنے ہاتھوں کو صاف کرتے ہوئے' اپنی روح کی طہارت کی جانب متوجہ ہو کے' ہم سے کہتے ہیں کہ جب

اس پانی' جب اس طہور' جب اس مادے کا سامنا کرو جسے خدانے پاکیزگی کا ذریعہ قرار دیا ہے' جب اس مادّے کی طرف جاؤ اور تمہاری نگاہ اس پر پڑے اور اپنے ہاتھوں کو اس سے دھوؤ اور پاک کرو تو یہ بات ذہن میں رکھو کہ ایک اور پاکیزگی بھی ہے' ایک اور پانی بھی ہے' وہ پاکیزگی روح کی پاکیزگی ہے اور وہ پانی' توبہ کا پانی ہے۔

کہتے ہیں کہ ہاتھوں کو دھونے کے بعد علیؑ اپنے چہرے پر پانی ڈالتے اور فرماتے: اَللّٰھُمَّ بَیِّضْ وَجْھِی یَوْمَ تَسْوَدُّ فِیهِ الْوُجُوهُ وَلَا تُسَوِّدْ وَجْھِی یَوْمَ تَبْیَضُّ فِیهِ الْوُجُوهُ۔

آپ اپنے چہرے کو دھوتے ہیں اور حسب ظاہر صاف کرتے ہیں۔ خوب! جب اپنے چہرے کو پانی سے دھوتے ہیں تو وہ سفید براق ہو جاتا ہے۔ لیکن علیؑ اسی پر اکتفا نہیں کرتے' اسلام بھی اسی پر اکتفا کا قائل نہیں۔ یہ عمل درست ہے اور اس پر عمل بھی کرنا چاہیے لیکن ایک اور پاکیزگی کے ساتھ اور ایک اور نورانیت کے ہمراہ' چہرے پر ایک اور سفیدی ہونی چاہیے۔ فرماتے ہیں: خدایا میرے چہرے کو اس دن روشن کر دینا جس دن چہرے سیاہ ہو جائیں (روزِ قیامت) اور اس دن چہرے کو سیاہ نہ کرنا جس دن چہرے روشن ہو جائیں۔

اس کے بعد دائیں ہاتھ پر پانی ڈال کے فرماتے ہیں: اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِی

كِتَابِي بِيَمِينِي وَالْخُلْدَ فِي الْجِنَانِ بِيَسَارِي وَ حَاسِبْنِي حِسَاباً يَسِيراً (خدایا! قیامت میں میرا نامہ اعمال میرے داہنے ہاتھ میں دینا (کیونکہ کامیاب اور نجات یافتہ لوگوں کا نامہ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا) اور جنت مجھے آسانی سے عنایت فرما دینا' اور حساب میں بھی آسانی فرمانا)۔ اس طرح آپ آخرت کے حساب کو یاد کرتے ہیں۔

اس کے بعد بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: اَللّٰهُمَّ لَا تُعْطِنِي كِتَابِي بِشِمَالِي وَلَا مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِي وَلَا تَجْعَلْهَا مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِي وَأَعُوذُبِكَ مِنْ مُقَطَّعَاتِ النِّيرَانِ (خدایا! میرے نامہ اعمال کو بائیں ہاتھ میں یا پشت کی طرف سے نہ دینا۔ (کچھ لوگوں کا نامہ اعمال انہیں پیچھے سے پکڑایا جائے گا اور یہ بھی ایک رمز ہے) اور نہ میرے ہاتھوں کو میری گردن سے باندھ دینا۔ میں جہنم کی آگ کے قطعات سے تیری پناہ چاہتا ہوں)

کہتے ہیں: اسکے بعد آپ نے سر کا مسح کرتے ہوئے فرمایا: اَللّٰهُمَّ غَشِّنِي بِرَحْمَتِكَ وَ بَرَكَاتِكَ (خدایا! مجھے اپنی رحمت اور برکتوں میں ڈبو دے)

پھر آپ نے پیر کا مسح کرتے ہوئے فرمایا: اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ قَدَمِي عَلَى الصِّرَاطِ يَوْمَ يَزِلُّ فِيهِ الْأَقْدَامُ (خدایا! میرے ان قدموں کو صراط پر اس

دن ثابت رکھنا جس دن سارے قدم پھسل رہے ہوں گے) وَاجْعَلْ سَعْیِی فِیمَا یُرْضِیکَ عَنِّی (میرے عمل اور کدوکاوش کو ان کاموں میں قرار دینا جو تجھے راضی کرسکیں)

ایسا وضو جو اس قدر عشق و اشتیاق اور توجہ و اہتمام کے ساتھ کیا جائے گا' وہ (بارگاہِ الٰہی میں) ایک علیحدہ ہی انداز سے قبول کیا جائے گا' اور وہ وضو جو ہم اور آپ کرتے ہیں اسکی قبولیت کسی اور طرح کی ہوگی۔

پس نماز کو معمولی نہیں سمجھنا چاہئے' سبک نہیں شمار کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ انسان دورانِ نماز صرف اسکے واجبات کی ادائیگی پر اکتفا کی کوشش کرے۔ (اور جب کوئی اسے اس جانب متوجہ کرے تو کہے کہ) آؤ' دیکھیں' مرجع تقلید کا فتویٰ کیا ہے' کیا وہ کہتے ہیں کہ (دوسری اور تیسری رکعت میں) تین مرتبہ سبحان اللہ' والحمد للہ' ولا الہ الا اللہ' واللہ اکبر کہنا چاہئے' یا اسے ایک ہی مرتبہ کہنا کافی قرار دیتے ہیں؟

جی ہاں (درست ہے کہ)' مجتہد فتویٰ دیتے ہیں کہ اسے ایک ہی مرتبہ کہنا کافی ہے۔ البتہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ احتیاطِ مستحب یہ ہے کہ اسے تین مرتبہ کہا جائے۔ لہٰذا ہمیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ جب مجتہد نے ایک مرتبہ کہنا کافی قرار دیا ہے تو ہم بھی صرف ایک ہی مرتبہ کہیں گے۔ یہ دراصل نماز سے جی چرانا ہے۔ ہمیں ایسا ہونا چاہئے کہ اگر مجتہد ایک مرتبہ کہنا واجب قرار دے

اور مزید دو مرتبہ کہنا مستحب سمجھے تو ہم بہتر سمجھتے ہوئے اس مستحب کو بھی انجام دیں ہے۔

روزے کو بھی معمولی اور خفیف نہیں بنا دینا چاہیے۔ بعض لوگوں کا روزہ رکھنے کا ایک خاص انداز ہے (یہ میں ازراہِ مذاق کہہ رہا ہوں) کہ نعوذ باللہ اگر میں خدا کی جگہ ہوں تو کسی صورت ان کا یہ روزہ قبول نہ کروں۔

میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ماہِ رمضان میں رات بھر نہیں سوتے۔ البتہ ان کی یہ شب بیداری عبادت کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ اس لئے جاگتے ہیں کہ ان کی نیند پوری نہ ہو سکے۔ صبح تک چائے پینے اور سگریٹ نوشی میں وقت گزارتے ہیں۔ صبح طلوع ہونے کے بعد اول وقت نمازِ فجر پڑھ کے سو جاتے ہیں اور (سارے دن سو کر) اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب ظہر اور عصر کی نماز کی ادائیگی کا انتہائی قلیل وقت باقی رہ جاتا ہے۔ اور پھر برق رفتاری سے یہ نمازیں پڑھنے کے بعد افطار کے سامنے آ بیٹھتے ہیں۔

آخر یہ کس قسم کا روزہ ہے؟

انسان رات بھر صرف اس لئے نہ سوئے کہ دن میں روزہ رکھ کر سوتا رہے تاکہ روزے کی سختی اور مشقت محسوس نہ کرے۔

کیا یہ روزے کو معمولی سمجھنا نہیں؟

میرے خیال میں تو یہ روزے کو گالی دینے کے مترادف ہے یعنی یہ تو

زبانِ حال سے یہ کہتا ہے کہ اے روزے! میں تجھ سے اس قدر نفرت کرتا ہوں کہ تیرا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا!!

ہم حج کرتے ہیں لیکن حقارت کے ساتھ' روزہ رکھتے ہیں لیکن معمولی بنا کے' نماز پڑھتے ہیں لیکن سبک کر کے' اذان کہتے ہیں لیکن بے حیثیت انداز میں۔

دیکھئے' ہم اذان کو کیسے بے حیثیت کرتے ہیں؟

موذن کا "صیّت" یعنی خوش آواز ہونا مستحب ہے۔ اسی طرح جیسے قرآنِ مجید کی قرأت کے لئے تجوید یعنی حروفِ قرآن کی خوبصورتی کے ساتھ ادائیگی' خوبصورت آواز میں قرآن پڑھنا سنت ہے' جو روح پر بھی بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی طرح اذان میں بھی مستحب یہ ہے کہ موذن "صیّت" یعنی خوش آواز ہو' اس انداز سے اذان کہے کہ سننے والوں پر وجد طاری کر دے' ان میں خدا کی یاد تازہ کر دے۔

بہت سے افراد خوش آواز ہیں اور اچھے انداز میں اذان کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے کہا جائے کہ جناب آگے بڑھئے' آج آپ اذان کہہ دیجئے تو وہ تیار نہیں ہوتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ دل ہی دل میں کہتے ہیں کہ کیا میں اس قدر حقیر شخص ہوں کہ موذن بنوں؟ جناب! موذن ہونے پر تو آپ کو فخر کرنا چاہئے' علی ابن ابی طالب علیہ

السلام موذن تھے۔ جس دور میں آپ خلیفہ تھے' اس دور میں بھی اذان کہا کرتے تھے۔ موذن ہونے کو اپنی توہین سمجھنا' یا موذن ہونے کو کسی خاص طبقے سے وابستہ قرار دینا اور یہ کہنا کہ میں جو اشراف وعمائدین میں سے ہوں' رجال وشخصیات میں میرا شمار ہوتا ہے' میں اذان دوں؟۔۔۔۔یہ سب باتیں اذان کی تحقیر کرنا اور اسے حقیر سمجھنا ہیں۔

پس ہمیں کسی بھی صورت میں عبادات کی تحقیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں ایک کامل اور جامع مسلمان ہونا چاہیے۔ اسلام کی حیثیت اور قدر و قیمت اسکی جامعیت میں ہے۔ نہ تو ہمارا کردار یہ ہو کہ صرف عبادات سے چپکے رہیں' اسکے سوا تمام چیزوں کو ترک کر دیں اور نہ ہی ہمیں دورِ حاضر میں پیدا ہونے والے ان لوگوں کی مانند ہونا چاہیے' جنہیں اسلام کی صرف اجتماعی تعلیمات ہی نظر آتی ہیں اور عبادات کی تحقیر کرنے لگیں۔

انشاء اللہ آئندہ شب جب ہم اسی بحث کے تسلسل میں عرائض پیش کریں گے تو دوسرے تمام اسلامی فرائض کی نظر سے عبادت کی اہمیت پر گفتگو کریں گے۔ اور واضح کریں گے کہ خود عبادت خدا کے تقرب کا ایک رکن اور مرکب (سواری) ہونے کے علاوہ' نیز علاوہ اس کے کہ "وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ "(۱) نماز کا مقصد یادِ خدا اور تقرب الٰہی ہے اور خدا کا تقرب اور اس

۱۔ اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔ (سورۂ طٰہٰ۲۰۔ آیت ۱۴)

سے نزدیکی خود اتنا بڑا مقصد ہے کہ اسے اپنے سے بڑھ کر کسی اور مقصد کی ضرورت نہیں (خود یہی اعلیٰ ترین مقصد ہے)۔ ان سب باتوں سے قطع نظر اگر ہم عبادت کی تحقیر کریں تو دوسرے تمام فرائض کی ادائیگی سے بھی رہ جائیں گے۔ عبادت تمام دوسرے اسلامی احکام وفرامین کی قوۂ مجریہ اور ان کے اجرا کی ضامن ہے۔

یہیں پر ہم اپنے عرائض ختم کرتے ہیں۔

خدایا! تجھے تیری درگاہ کے عبادت گزار بندوں کے حق کا واسطہ' ان صاحبانِ قرآن کے صدقے' اپنے پاکیزہ اور مخلص مناجات کرنے والوں کے صدقے' ہم سب کو حقیقی عبادت گزاروں میں قرار دے۔

بارالٰہا! ہمیں دین اسلام کی جامعیت سے آشنا فرما اور ہمیں ایک جامع مسلمان بنادے۔

پروردگارا! ہم سب کو خلوصِ نیت کی توفیق کرامت فرما۔

الٰہی! ان محترم شبوں میں ہمارے گناہوں کو بخش دے' ہمارے مرحومین کی مغفرت فرما۔

رَحِمَ اللهُ قَرَأَ الْفَاتِحَةَ مَعَ الصَّلَوَات.

❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عبادت ونماز

(۴)

"اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ." (۱)

عبادت اور تربیت

اسلام میں عبادات اصل اور بنیاد کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ انکی تربیتی اسکیم کا حصہ بھی ہیں۔ اس بات کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ: عبادات کے اصل اور بنیاد کے حامل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے ہر پہلو سے قطع نظر، انسانی زندگی کے مسائل سے قطع نظر خود عبادت مقاصدِ خلقت میں سے ہے۔

"وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ۔"

"اور میں نے جنات اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔"

(سورۂ ذاریات ۵۱- آیت ۵۶)

۱۔ بے شک نماز ہر برائی اور بدکاری سے روکنے والی ہے اور اللہ کا ذکر بہت بڑی شے ہے۔ (سورۂ عنکبوت ۲۹- آیت ۴۵)

عبادت انسان کے حقیقی کمال اور تقرب الٰہی کا ایک وسیلہ ہے۔

ایسی چیز جو خود انسان کے کمال کا مظہر' اور خود ہدف اور غایت ہے اسکے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی دوسری چیز کا مقدمہ اور وسیلہ ہو۔ لیکن اسکے باوجود 'عبادات اس اصالت کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ دوسری چیز کا مقدمہ بھی ہیں۔ یعنی جیسا کہ ہم نے عرض کیا (عبادات) اسلام کی تربیتی اسکیم کا حصہ ہیں۔ یعنی اسلام' جو اخلاقی اور اجتماعی لحاظ سے افراد کی تربیت کرنا چاہتا ہے' وہ اس مقصد کے لئے جو وسائل اختیار کرتا ہے ان میں سے ایک وسیلہ عبادت ہے اور اتفاق سے یہ وسیلہ انسان کے اخلاق اور روح پر ہر دوسرے وسیلے سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ ایسا کس طرح ہے؟ ہم آئندہ سطور میں اس کی وضاحت کریں گے۔

اخلاقی مسائل کا محور ''ایثار و فداکاری'' اور اپنے فائدے اور مفاد کو پس پشت رکھنا ہے۔ جس طرح ''حمیہ'' یعنی پرخوری سے اجتناب' جسمانی سلامتی کا ایک اصول ہے' جو (جسمانی صحت سے متعلق) تمام خوبیوں کی اساس اور بنیاد ہے' اسی طرح اخلاق میں بھی ایک چیز ہے' جو تمام اخلاقی مسائل کی اصل اساس ہے' اور وہ ہے اپنی ذات سے گزر جانا' اپنی ذات کو بھلا دینا' ''انانیت'' کی اسیری سے آزاد ہو جانا اور ''میں'' کو ترک کر دینا۔

اجتماعی مسائل میں عدالت کا اصول تمام اصولوں کی ماں ہے۔ عدالت'

یعنی دوسرے افراد کے حق کو ملحوظ رکھنا' ان کے حقوق کی رعایت کرنا۔

وہ مشکل جس سے انسانیت اخلاقی مسائل میں بھی دوچار ہے اور اجتماعی مسائل میں بھی اس کا سامنا کر رہی ہے' وہ ان اصولوں کو روبہ عمل لانے کا مسئلہ ہے۔ یعنی کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو اخلاق سے ناواقف ہو' یا اس بات کا علم نہ رکھتا ہو کہ عدالت کس درجہ ضروری ہے۔ لیکن مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ان اصولوں پر عمل کا مرحلہ آتا ہے۔

جس وقت انسان کسی اخلاقی اصول کی پابندی کرنا چاہتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ اسکا مفاد اور منفعت ایک طرف ہے اور اس اخلاقی اصول کی پابندی دوسری طرف ۔ وہ دیکھتا ہے کہ راست گوئی ایک طرف ہے اور منفعت اور فائدہ دوسری طرف ۔ یا تو وہ جھوٹ بولے' خیانت کرے اور نفع حاصل کرلے' یا پھر سچ بولے' امانت داری کا ثبوت دے اور اپنے منافع کو پس پشت ڈال دے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ عدل و اخلاق کا دم بھرنے والا انسان بھی عمل کے موقع پر اخلاق اور عدالت کی مخالف راہ اختیار کرتا ہے۔

ایمان کی تاثیر

جو چیز اخلاق اور عدالت کی پشت پناہ اور ضمانت ہے' اور جو اگر انسان میں پیدا ہو جائے تو انسان بآسانی اخلاق اور عدالت کے راستے پر قدم بڑھا سکتا ہے اور اپنے نفع اور مفاد سے دستبردار ہو سکتا ہے' وہ صرف ''ایمان

ہے۔"

البتہ کونسا ایمان؟ جی ہاں' خود عدالت پر ایمان' خود اخلاق پر ایمان۔

انسان میں عدالت پر ایک مقدس امر کے طور پر' اخلاق پر ایک مقدس امر کے طور پر ایمان کب پیدا ہوتا ہے؟

(یہ ایمان) اس وقت (پیدا ہوتا ہے) جب وہ تقدس کی اصل و اساس یعنی "خدا" پر ایمان رکھتا ہو۔ لہٰذا انسان عملاً اتنا ہی عدالت کا پابند ہوتا ہے جتنا خدا کا معتقد ہوتا ہے' عملاً اتنا ہی اخلاق کا پابند ہوتا ہے جتنا خدا پر ایمان رکھتا ہے۔

ہمارے دور کی مشکل یہی ہے کہ (لوگ) سمجھتے ہیں کہ "علم" کافی ہے۔ یعنی بااخلاق اور عادل ہونے کیلئے ہمارا عدالت اور اخلاق سے واقف ہونا اور ان کا علم رکھنا ہی کافی ہے۔ لیکن تجربے نے بتایا ہے کہ اگر علم سے ایمان کا رشتہ ٹوٹا ہوا ہو' تو یہ عدالت اور اخلاق کے لئے نہ صرف مفید نہیں' بلکہ مضر بھی ہے۔ اور "سنائی" کے اس قول کے مصداق ہو جاتا ہے کہ: چو دزد با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا (جب چور چراغ کے ہمراہ آتا ہے تو اچھی طرح چن چن کے مال لے جاتا ہے)

لیکن اگر ایمان پیدا ہو جائے' تو اخلاق اور عدالت میں استحکام آجاتا ہے۔ مذہبی ایمان کے بغیر اخلاق اور عدالت ایسے ہی ہے جیسے بغیر ضمانت کے

کرنسی نوٹوں کا جاری کردینا۔ جب مذہبی ایمان آجاتا ہے تو اخلاق اور عدالت بھی آجاتے ہیں۔

یہیں پہنچ کر ہمیں نظر آتا ہے کہ اسلام نے خدا کی پرستش اور عبادت کو اخلاق اور عدالت سے جدا ایک علیحدہ مسئلہ قرار نہیں دیا ہے۔ یعنی جس عبادت کا اسلام حکم دیتا ہے اسکی چاشنی اخلاق اور عدالت کو قرار دیتا ہے۔ یا یہ کہیں کہ جس عدالت اور اخلاق کو تجویز کرتا ہے، اسکی چاشنی عبادت کو قرار دیتا ہے کیونکہ اسکے بغیر یہ ممکن نہیں۔

ایک مثال عرض کرتا ہوں: آپ کو کہاں، اور دنیا میں پائے جانے والے مکاتیب و ادیان میں سے کس مکتب اور دین میں یہ بات نظر آتی ہے کہ ایک مجرم خود اپنے قدموں سے چل کر آئے اور اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کرے؟ مجرم تو ہمیشہ سزا سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ واحد قدرت جو مجرم کو خود اپنے قدموں پر چلا کے اور اپنے ارادے اور اختیار سے سزا کی طرف لاتی ہے وہ "ایمان" کی طاقت ہے، اسکے سوا کوئی اور چیز ایسا نہیں کرسکتی۔

جب ہم اسلام کے ابتدائی دور پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسی بکثرت مثالیں نظر آتی ہیں۔ البتہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں، تو اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس ابتدائی دور کے سوا کسی اور دور میں ایسی مثالیں نہیں ملتیں۔ نہیں، صدر اسلام کے علاوہ دوسرے ادوار میں بھی، لوگوں

میں پائے جانے والے ایمان کے تناسب سے ایسی مثالیں موجود ہیں۔

اسلام نے مجرم کے لئے سزاؤں کا تعین کیا ہے۔ مثلاً شراب نوشی کے مرتکب فرد زناکار اور چور کے لئے سزائیں معین کی ہیں۔ دوسری طرف اسلام میں ایک اصول ہے اور وہ یہ ہے کہ اَلْحُدُوْدُ تَدْرَأُ بِالشُّبُهَاتِ یعنی حدود معمولی شبہے پر دفع ہو جاتے ہیں۔ اسلام قاضی اور حاکم کو اس بات کا پابند نہیں کرتا کہ وہ مجرم کو تلاش کرنے کے لئے جاسوسی کریں' تجسس کریں۔ بلکہ مجرم کے دل میں ایک طاقت ڈالتا ہے جس کے اثر سے وہ خود اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں' امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے دور میں کثرت کے ساتھ ایسا ہوا کرتا تھا کہ لوگ خود پیغمبر یا امام کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کرتے کہ یا رسول اللہ (یا امیر المومنین) ہم فلاں جرم کے مرتکب ہوئے ہیں' ہمیں سزا دیجئے۔ ہم آلودہ ہیں' ہمیں پاک کر دیجئے۔

ایک شخص رسول اکرم کی خدمت میں آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے زنا کیا ہے' مجھے سزا دیجئے۔ (کیونکہ اس قسم کے مسائل میں ایسے شخص کے لئے چار مرتبہ اقرار کرنا ضروری ہے' ایک مرتبہ کا اقرار کافی نہیں' لہٰذا) پیغمبر نے فرمایا: لَعَلَّکَ قَبَّلْتَ شاید تم نے اس عورت کا بوسہ لیا ہو گا اور کہہ رہے ہو کہ میں نے زنا کیا ہے (یعنی آنحضرت اسکے منہ میں الفاظ رکھ رہے ہیں)۔ اگر وہ

کہے کہ ہاں میں نے بوسہ لیا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ بوس و کنار بھی زنا کی مانند ہے اور معاملہ صرف یہیں پر ختم ہو گیا ہو گا۔ اس نے کہا: نہیں' اے اللہ کے رسول! میں نے زنا کیا ہے۔ فرمایا: لَعَلَّکَ غَمَزْتَ 'شاید تو نے برائی کا صرف ارادہ کیا ہو گا' یا اسکے جسم کو گدگدایا ہو گا۔ (شاید وہ کہے کہ ہاں' ایسا ہی تھا' اس سے زیادہ میں نے کچھ نہیں کیا تھا)۔ اس نے کہا: نہیں' اے اللہ کے رسول! میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں۔ آپ نے فرمایا: شاید تو زنا کے قریب پہنچ گیا ہو اور درحقیقت زنا واقع نہ ہوا ہو؟ اس نے کہا: نہیں' اے اللہ کے رسول! میں آلودہ ہوا ہوں' میں ناپاک ہو گیا ہوں۔ میں اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھ پر حد جاری فرمائیں اور اسی دنیا میں مجھے سزا دیں' میں نہیں چاہتا کہ میرا یہ جرم دوسری دنیا میں میرے ساتھ جائے۔

یہ حدیث جسے ہم اب پیش کر رہے ہیں "کافی" میں ہے (فروع کافی۔ج ۷۔ص ۱۶۵)

ایک عورت امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا: اے امیر المومنین! میں نے زنائے محصنہ کا ارتکاب کیا ہے' میں شادی شدہ ہوں' شوہر کی غیر موجودگی میں زنا کی مرتکب ہوئی ہوں اور اسکے نتیجے میں حاملہ ہو گئی ہوں۔ "طَهِّرْنِي" "مجھے پاک کر دیجئے" میں آلودہ ہوں۔ امام نے فرمایا: ایک مرتبہ کا اقرار کافی نہیں' چار مرتبہ اقرار کرنا ضروری ہے(۱) پھر یہ کہ اگر

۱۔ اسلام میں کسی صورت حتیٰ قاضی تک کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ تجسس کرے یا بہانے سے اقرار لے بلکہ جب کوئی انسان اقرار کرتا ہے تو قاضی ایک بہانے کے ذریعے اسکے اقرار کو مسترد کرتا ہے۔

ایک شادی شدہ عورت زنا کی مرتکب ہو تو اسے "رجم" یعنی سنگسار کیا جائے گا۔
میں اگر تمہیں سنگسار کرنے کا حکم دوں گا تو اس بچے کا کیا بنے گا جو تمہارے شکم
میں ہے؟ بچے کو تو ہم سنگسار نہیں کر سکتے۔ تم جاؤ' بچے کی پیدائش کے بعد آنا' ہم
اس بچے کی وجہ سے تمہیں سنگسار نہیں کر سکتے۔ یہ سن کر وہ عورت چلی گئی۔

چند ماہ بعد دیکھتے ہیں کہ وہی عورت چلی آرہی ہے' ایک بچہ بھی اس کی
گود میں ہے۔ کہتی ہے: یا امیر المومنین طھرنی اے امیر المومنین! مجھے
پاک کر دیجئے۔ بولی' میرا عذر یہ بچہ تھا' اب یہ دنیا میں آچکا ہے (یہ دوسرا اقرار
تھا)۔ امیر المومنین نے فرمایا: اب اس موقع پر اگر ہم تجھے سنگسار کر دیں تو اس
بچے کا کیا قصور ہے؟ ابھی اسے ماں کی ضرورت ہے' اسے ماں کا دودھ چاہئے'
یہ ماں کی دیکھ بھال اور نگہداشت کا طالب ہے۔ فی الحال جاؤ' ابھی اس بچے کو
تمہاری ضرورت ہے۔ وہ عورت دل شکستہ اور رنجیدہ حالت لئے لوٹ گئی۔

ایک دو سال بعد وہ عورت دوبارہ آئی' بچہ بھی اسکے ساتھ تھا اور آ کے
کہنے لگی: یا امیر المومنین! طھرنی" اب میرا بچہ دودھ نہیں پیتا' اسے
دودھ پلانے والی کی ضرورت نہیں رہی' بڑا ہو گیا ہے۔ اب مجھے پاک کر
دیجئے۔ فرمایا: نہیں' ابھی اس بچے کو ماں کی ضرورت ہے۔ ابھی جاؤ۔ یہ سن کر
اس عورت نے بچے کا ہاتھ پکڑا' اب وہ روتی جاتی تھی اور یہ کہتی جاتی تھی کہ:
خدایا! یہ تیسری مرتبہ ہے کہ میں گناہ کی اس آلودگی سے پاک ہونے کی غرض

سے تیرے (مقرر کردہ) امام کی خدمت میں آئی ہوں، خلیفۂ مسلمین کے پاس آئی ہوں اور وہ ہیں کہ ہر مرتبہ ایک بہانہ کر کے مجھے واپس لوٹا دیتے ہیں۔ بارالہا! میں اس گندگی سے چھٹکارا چاہتی ہوں، میں آئی ہوں کہ وہ مجھے سنگسار کریں اور میں پاک ہو جاؤں۔ وہ یہ کہتی ہوئی جا رہی تھی کہ اتفاقاً اس پر عمرو بن حریث کی نگاہ پڑ گئی، یہ ایک منافق انسان تھا۔ اس نے عورت سے پوچھا: کیا ہوا؟ کیا معاملہ ہے؟ عورت نے پورا قصہ کہہ سنایا۔ عمرو بن حریث نے کہا: آؤ میرے ساتھ، میں تمہارا مسئلہ حل کرتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ بچہ میرے حوالے کر دو، میں اس کی کفالت قبول کرتا ہوں۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ علی اس عورت سے چوتھی مرتبہ اقرار لینا نہیں چاہتے۔

امام دیکھتے ہیں کہ وہ عورت اپنے بچے اور عمرو بن حریث کے ساتھ واپس چلی آ رہی ہے۔ آپ کے نزدیک آتی ہے اور کہتی ہے: **یا امیر المومنین! طھرنی** (اے امیر المومنین! مجھے پاک کر دیجئے) میں نے زنا کیا ہے، بچے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے، اس شخص نے اسے پالنے پوسنے کی ذمے داری لے لی ہے، اب آپ مجھے پاک کر دیجئے۔۔۔

کہتے ہیں کہ امیر المومنین کو معاملے کا یہاں تک پہنچنا بہت ناگوار گزرا۔

یہ ایمان اور مذہب کی طاقت ہے جو انسان کے ضمیر کی گہرائیوں میں اثر انداز ہو کر اسے عدالت اور اخلاق کے سامنے جھکا دیتی ہے۔ عبادت اس لئے

ہے تاکہ انسان کی ایمانی حیات کی تجدید ہو' اسکا ایمان تازہ ہو' اس میں طراوت اور نشاط پیدا ہو' وہ قوت اور طاقت حاصل کرے۔

جتنا انسان کا ایمان زیادہ ہوگا' اتنا ہی وہ خدا کو زیادہ یاد رکھے گا' اور جتنا انسان کو خدا یاد رہے گا اتنا ہی وہ گناہ کا کم مرتکب ہوگا۔ گناہ اور نافرمانی کرنے یا نہ کرنے کا دارومدار علم پر نہیں ہے' اسکا دارومدار غفلت اور یاد پر ہے۔ جتنا انسان غافل ہوگا' یعنی اس نے جتنا خدا کو فراموش کردیا ہوگا' اتنا ہی زیادہ وہ گناہ کا ارتکاب کرے گا اور جتنا زیادہ وہ خدا کو یاد رکھے گا' اتنی ہی اسکی نافرمانیاں کم ہوں گی۔

عصمت اور ایمان

آپ نے سنا ہوا ہے کہ انبیا اور ائمہ معصوم ہوتے ہیں۔ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ انبیا اور ائمہ کے معصوم ہونے کے کیا معنی ہیں؟ تو آپ اسکا جواب دیں گے کہ وہ کبھی کسی بھی صورت میں گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔

ٹھیک ہے۔ (عصمت کے) معنی یہی ہیں۔ لیکن اگر اسکے بعد آپ سے سوال کیا جائے کہ (یہ لوگ) کیوں گناہ نہیں کرتے؟ تو ممکن ہے آپ اس سوال کا دو طرح سے جواب دیں۔ ایک یہ کہ انبیا اور ائمہ اس وجہ سے معصوم ہیں اور گناہ نہیں کرتے کہ خداوند عالم ان کے ارتکاب گناہ میں رکاوٹ ہے' اس نے انہیں بالجبر گناہ اور معصیت سے روکا ہوا ہے۔ یعنی جب کبھی وہ گناہ کرنا

چاہتے ہیں' خدا رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہے اوران کا راستہ روک دیتا ہے۔

اگر عصمت کے معنی یہ ہیں تو یہ (انبیا اور ائمہ کے لئے) کوئی فضیلت اور کمال نہیں۔ اگر میرے اور آپ کے ساتھ بھی اسی طرح ہونے لگے کہ جوں ہی ہم گناہ کرنا چاہیں' خدا کی نافرمانی کرنا چاہیں تو ایک خارجی طاقت ہمارے راستے میں حائل ہو جائے' ہمارے مانع و مزاحم ہو جائے اور ہمارے اور گناہ کے درمیان رکاوٹ بن جائے۔ ایسی صورت میں بحالتِ مجبوری ہم بھی گناہ سے محفوظ رہیں گے۔

پس' ایسی صورت میں انہیں (انبیا اور ائمہ کو) ہم پر کیا فضیلت ہوئی؟ اس صورت میں ان کے اور ہمارے درمیان صرف یہ فرق ہوگا کہ وہ خدا کے ایسے بندے ہیں جنہیں اس نے خاص امتیاز دیا ہوا ہے' جب وہ خدا کی نافرمانی کرنا چاہتے ہیں' تو خدا ان کے راستے میں حائل ہو جاتا ہے لیکن (ہمیں یہ امتیاز حاصل نہیں) جب ہم نافرمانی کا ارادہ کرتے ہیں' تو خدا ہمارا راستہ نہیں روکتا۔

نہیں' یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔

ان (انبیا اور ائمہ) کے معصوم ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ گناہ کرنا چاہتے اور خدا ان کے مانع ہو جاتا ہے!

پس پھر حقیقت کیا ہے؟

عصمت کے معنی' ایمان کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہونا ہے۔ جتنا

ایمان زیادہ ہوگا اتنا ہی انسان کو خدا زیادہ یاد رہے گا۔ مثلاً ایک بے ایمان انسان ایک روز گزارتا ہے ایک ہفتہ گزارتا ہے ایک مہینہ گزارتا ہے جو چیز اسکے ذہن میں پھٹکتی تک نہیں وہ خدا ہے۔ ایسا شخص یکسر غافل ہے۔

بعض لوگوں کو کبھی کبھی خدا یاد آتا ہے۔ اس موقع پر انہیں خیال ہوتا ہے کہ ہمارا ایک خدا ہے خدا ہمارے سروں پر ہے اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ لیکن خدا اسی ایک لمحے کے لئے ان کے ذہن میں آتا ہے اسکے بعد وہ اسے ایسے بھلا بیٹھتے ہیں جیسے سرے سے کسی خدا کا وجود ہی نہیں۔

لیکن کچھ افراد جن کا ایمان (مذکورہ بالا لوگوں سے کچھ) زیادہ ہوتا ہے کبھی غفلت میں ہوتے ہیں کبھی بیدار۔ جب غافل ہوتے ہیں تو ان سے گناہ صادر ہوتے ہیں لیکن جب بیدار ہوتے ہیں تو اس بیداری کے نتیجے میں ان سے گناہ صادر نہیں ہوتے۔ کیونکہ جب وہ خدا کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو ان سے گناہ کے صدور کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ **لا یزنی الزانی وھو مومن** (کوئی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرسکتا۔ وسائل الشیعہ - ج ۱ - ص ۲۴ - ح ۱۴)

جب انسان کی روح میں سچا ایمان موجود ہو اور وہ بیدار ہو تو گناہ میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اب اگر انسان کا ایمان کمال کی حدوں کو چھو لے یہاں تک کہ وہ خدا کو ہمیشہ حاضر و ناظر سمجھنے لگے۔ یعنی خدا ہمیشہ اس کے دل میں موجود ہو تو اس صورت میں وہ کبھی بھی غافل نہیں ہوتا ہر عمل کی انجام دہی کے دوران خدا

کی یاد اسکے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:

"رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ"

"وہ مرد جنہیں کاروبار یا خرید و فروخت ذکرِ خدا سے غافل نہیں کر سکتی۔"

(سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۳۷)

(قرآن) یہ نہیں کہتا کہ وہ لوگ جو تجارت نہیں کرتے۔ اسلام لوگوں کو تجارت اور کاروبار سے روکنے کے لئے نہیں آیا۔ یہ نہیں کہتا کہ تجارت نہ کرو۔ اسکے برعکس حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ محنت کرو' کماؤ' کاروبار کرو' تجارت کرو۔ وہ لوگ جو خرید و فروخت کرتے ہیں' تجارت کرتے ہیں' کماتے ہیں' ملازمت کرتے ہیں لیکن ان سب چیزوں کے باوجود ایک لمحے کے لئے بھی خدا سے غافل نہیں ہوتے۔ دکان کے کاؤنٹر پر کھڑے ہوتے ہیں' چیزیں فروخت کرتے ہیں' تولتے ہیں' بولتے ہیں' پیسے لیتے ہیں اور مال حوالے کرتے ہیں لیکن جس چیز کو وہ ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہیں کرتے وہ "خدا" ہے۔ خدا ہمیشہ ان کے ذہن میں رہتا ہے۔

اگر کوئی ہمیشہ بیدار ہو' ہمیشہ خدا اسکے ذہن میں ہو' تو قدرتی بات ہے کہ وہ کبھی بھی گناہ کا مرتکب نہیں ہوگا۔ البتہ ہم ایسی دائمی بیداری معصومین علیہم السلام کے سوا کسی اور میں نہیں پاتے۔ (چنانچہ) معصومین یعنی وہ لوگ جو کسی

بھی لمحے خدا کو نہیں بھولتے۔

آپ کی خدمت میں ایک مثال عرض کرتا ہوں: کیا کبھی آپ کے ساتھ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ (آپ نے جانتے بوجھتے) اپنا ہاتھ آگ میں ڈال دیا ہو یا آگ میں کود پڑے ہوں؟ اگر آپ کو معلوم نہ ہو بے خبری میں ایسا ہو گیا ہو تو دوسری بات ہے۔ پوری زندگی میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوتا کہ ہم میں سے کوئی ارادتاً خود کو آگ میں جھونک دے۔ البتہ اگر ہم خودکشی کرنا چاہیں تو (بات دوسری ہے)۔

ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لئے ہے کہ ہم بخوبی یہ بات جانتے ہیں کہ آگ کا کام جلانا ہے' یہ جانتے ہیں کہ اگر آگ کے بھڑکتے شعلوں میں گر جائیں تو یقیناً زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ ہم قطعی اور یقینی طور پر اس بات کا علم رکھتے ہیں اور جوں ہی ہمیں آگ نظر آتی ہے یہ علم ہمارے ذہن میں حاضر ہو جاتا ہے اور ہم ایک لمحے کے لئے بھی اس سے غافل نہیں ہوتے۔ لہٰذا ہم اپنے آپ کو آگ میں جھونکنے سے معصوم ہیں۔ یعنی ہمیں حاصل یہ علم و یقین اور ایمان کہ آگ جلانے کی صلاحیت رکھتی ہے' ہمیں آگ میں کود پڑنے سے باز رکھتے ہیں۔

جتنا ہم آگ کے جلانے کی صلاحیت پر ایمان رکھتے ہیں' اتنا ہی اولیائے خدا' گناہ کے جلانے کی صلاحیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ معصوم

ہوتے ہیں (کسی گناہ کے قریب نہیں جاتے)۔

اب جبکہ معصوم کے معنی معلوم ہو چکے ہیں' تو اس جملے کا مقصد بھی واضح ہو گیا ہو گا کہ "عبادت اسلام کی تربیتی اسکیم کا حصہ ہے"۔ عبادت اس لئے ہے کہ انسان کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد خدا کی یاد دلائی جائے اور انسان کو جتنا خدا یاد ہو گا اتنا ہی زیادہ وہ اخلاق' عدالت اور حقوق کا پابند ہو گا۔ یہ ایک بالکل واضح (clear) بات ہے۔

اسلام' دنیا اور آخرت کا جامع

اب اپنی پوری توجہ اس موضوع پر مرکوز فرمایئے کہ اسلام میں دنیا اور آخرت کس طرح باہم ملے ہوئے ہیں۔ اسلام مسیحیت کی طرح نہیں ہے۔ مسیحیت میں دنیا اور آخرت کا حساب جدا جدا ہے۔ مسیحیت کہتی ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں علیحدہ علیحدہ عالم ہیں (ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جا سکتا ہے)' یا یہ' یا وہ۔ لیکن اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ اسلام آخرت کو دنیا کے ساتھ اور دنیا کو آخرت کے ہمراہ قرار دیتا ہے۔ مثلاً نمازہی کو لے لیجئے' اسکا خالص اخروی پہلو یہ ہے کہ انسان خدا کو یاد کرے' خوفِ خدا رکھے۔

حضورِ قلب اور خدا کی جانب متوجہ ہونے کیلئے اس قدر ادب آداب کی ضرورت نہیں کہ انسان پہلے جا کے وضو کرے' اپنے آپ کو دھوئے' صاف کرے۔ کیا خدا سے ملاقات کے لئے وضو اور پاکیزگی کوئی تاثیر رکھتی ہے؟

خدا کے حضور جانے کے لحاظ سے اس بات کی کوئی تاثیر نہیں کہ انسان کا منہ دھلا ہوا ہے یا نہیں، لیکن خداوند عالم فرماتا ہے: اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ (۱) پھر اسکے بعد نماز پڑھو۔

دیکھا آپ نے (اسلام نے) صفائی کو عبادت کے ساتھ ملا دیا ہے: وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (۲) اور یہاں عبادت کے ساتھ پاکیزگی کا ذکر ہے۔

اگر آپ نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو آپ کی عبادت کی جگہ مباح ہونی چاہئے، غصب شدہ نہ ہو۔ وہ جانماز جس پر کھڑے ہو کر آپ نماز پڑھتے ہیں، وہ لباس جسے پہن کر آپ نماز ادا کرتے ہیں، اسے حلال اور مباح ہونا چاہئے۔ اگر آپ کے لباس کا ایک دھاگا بھی غصبی ہو، تو آپ کی نماز باطل ہو جائے گی۔ اس مقام پر عبادت حقوق کا دامن تھام لیتی ہے۔ خدا کی عبادت کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ کہا جا رہا ہے کہ (لوگوں کے) حقوق کا بھی احترام کیجئے۔ یعنی اسلام کہتا ہے کہ میں ایسی عبادت قبول ہی نہیں کرتا جس میں دوسروں کے حقوق کا پاس ولحاظ نہ رکھا گیا ہو۔

لہٰذا جب نماز پڑھنے والا کوئی شخص، نماز پڑھنا چاہتا ہے تو پہلے یہ دیکھتا

۱۔ ایمان والو جب بھی نماز کے لئے اٹھو تو پہلے اپنے چہروں کو اور کہنیوں تک اپنے ہاتھوں کو دھوؤ۔ (سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۶)

۲۔ اور اگر جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کرو۔ (سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۶)

ہے کہ یہ گھر جس میں میں ہوں اُسے میں نے کسی سے بالجبر تو نہیں ہتھیایا؟ اگر جبراً قابض ہوں تو میری نماز باطل ہوگی۔ پس اگر وہ نماز پڑھنا چاہتا ہے تو مجبور ہے کہ پہلے اپنے لئے ایک ایسے گھر کا بندوبست کرے جو اسکے لئے حلال ہو۔ یعنی اسکے اصل مالک سے خریدا ہوا ہو یا وہ (مالک) اسکے وہاں رہنے سے راضی ہو۔ وہ جس فرش پر کھڑا ہے اس کا مسئلہ بھی یہی ہے۔ اسکا لباس بھی ایسا ہی ہونا چاہئے حتیٰ اگر ناداروں کے حقوق خمس یا زکات (وغیرہ) بھی اس کے ذمے ہوں تو انہیں بھی ادا کرے۔ اگر اس نے انہیں ادا نہ کیا ہوگا تو بھی اسکی نماز باطل ہوگی۔

اسی طرح (اسلام) ہم سے کہتا ہے اگر نماز پڑھنا چاہتے ہو تو تم سب کو کعبہ کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونا ہوگا۔ کعبہ کہاں ہے؟ وہ اوّلین معبد جو دنیا میں خدا کی پرستش کے لئے بنایا گیا کہاں واقع ہے؟: اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا (بے شک سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے وہ مکہ میں ہے مبارک ہے۔ سورہ آل عمران ۳۔ آیت ۹۶) تم سب پر اس اوّلین معبد اور مسجد کی سمت رخ کر کے کھڑا ہونا لازم ہے جسے خدا کے عظیم پیغمبر ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند اسماعیل علیہ السلام نے تعمیر کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم کعبہ کی طرف رخ کر کے کیوں کھڑے ہوں؟ کیا

وہاں خدا ہے؟ کیا خدا (معاذ اللہ) خانۂ کعبہ کے اندر ہے؟ قرآن مجید جو یہ کہتا ہے کہ: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ(۱)۔ تم جہاں کہیں رخ کر کے کھڑے ہو جاؤ' وہیں خدا ہے' تم چاہے دائیں طرف رخ کرو یا بائیں طرف' خدا کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو۔ اوپر رخ کرو یا نیچے' خدا کی طرف تمہارا رخ ہو گا۔ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: اگر تمہیں رسی سے باندھ کر نیچے زمین کے ساتویں طبقے تک بھی لے جائیں تب بھی خدا کی طرف جاؤ گے۔ مشرق کی طرف جاؤ' تب بھی خدا کی طرف جاؤ گے' مغرب کی طرف جاؤ' تب بھی خدا کی طرف جاؤ گے' یہاں جو بیٹھے ہوئے ہو' خدا کے ساتھ ہو۔ خدا کی کوئی سمت نہیں۔

(اگر ایسا ہے تو) پھر ہم کعبہ کی طرف رخ کر کے کیوں کھڑے ہوں؟

(اسلام) کہتا ہے کہ آپ عبادت کی انجام دہی کے دوران ایک اجتماعی تعلیم و تربیت بھی حاصل کیجئے۔ آپ سب کو ایک نقطۂ واحد کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونا چاہئے' اگر ایسا نہ ہو تو ایک شخص ایک طرف رخ کئے کھڑا ہو گا اور دوسرا دوسری طرف اور یہ تفرقے اور انتشار کی علامت ہے۔ لیکن اگر تمام لوگ ایک نقطے کی جانب رخ کر کے کھڑے ہوں' تو اسکا مطلب ہے کہ سب یکسو ہیں۔

۱۔ لہٰذا تم جس جگہ بھی قبلے کا رخ کر لو گے سمجھو وہیں خدا موجود ہے۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۱۵)

تمام مسلمانوں کی ایک ہی سمت اور جہت ہونی چاہئے' اس مقصد کے لئے کس نقطے کا انتخاب کریں جس میں شرک کی بو بھی نہ پائی جاتی ہو؟ ۔۔۔(اسلام) کہتا ہے کہ اس نقطے کا انتخاب کرو جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونا یہ کہلائے کہ تم نے عبادت کا احترام ملحوظ رکھا ہے' اس سمت رخ کر کے کھڑے ہو جو اولین معبد ہے' معبد کا احترام عبادت کا احترام ہے۔

پھر (اسلام) کہتا ہے کہ اگر عبادت کرنا چاہتے ہو تو اسکا ایک متعین اور خاص وقت ہے' اس میں سیکنڈوں کا بھی خیال رکھا جانا چاہئے۔ صبح کی نماز کا وقت طلوع صبح کے آغاز سے لے کر طلوع آفتاب کی ابتداء تک ہے۔ اگر تم نے جانتے بوجھتے صبح طلوع ہونے سے ایک سیکنڈ پہلے یا سورج طلوع ہونے کے بعد نماز شروع کی تو تمہاری نماز باطل ہوگی' درست نہ ہوگی۔ نماز کو ان دو (اوقات) کے درمیان ہونا چاہئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کہیں کہ مجھے نیند آ رہی ہے' رات بھر کا جاگا ہوا ہوں' گو ابھی صبح طلوع ہونے میں ایک گھنٹہ باقی ہے' یوں بھی خدا کو نہ تو نیند آتی ہے اور نہ بیداری کا اس سے کوئی تعلق ہے' کیا خدا طلوعین کے درمیان (معاذ اللہ) اپنا مخصوص لباس پہن کر نماز قبول کرنے کے لئے تیار ہو کے بیٹھتا ہے؟ ۔۔۔خدا کے لئے تو تمام ساعات اور تمام لحات مساوی ہیں: لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (۱)۔ لہذا کیونکہ میں نے رات جاگ

۱۔ اسے نہ نیند آتی ہے اور نہ اونگھ۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۵)

کر گزاری ہے' بہت زوروں کی نیند آ رہی ہے' کیوں نہ آدھے گھنٹے پہلے نماز پڑھ لوں۔

نہیں جناب' وقت کی پابندی ضروری ہے۔ اپنے مقررہ وقت کے علاوہ کسی دوسرے وقت میں نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔

کیا خدا کی نظر میں اِس وقت یا اُس وقت کے درمیان کوئی فرق ہے؟

نہیں'

ہاں' آپ کے لئے فرق ہے۔ نماز کے ذریعے آپ کی تربیت مقصود ہے' اگر آپ رات کو دو بجے تک بھی بیدار رہے ہیں' تب بھی آپ کو طلوعین کے درمیان اٹھ کر نماز ادا کرنی چاہیے۔ یہی حال ظہر اور عصر کی نمازوں کا ہے' (یہ بھی) قبل از وقت قبول نہیں' وقت گزرنے کے بعد بھی قبول نہیں۔ مغرب اور عشا کی نمازوں میں بھی ایسا ہی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز تو عبادت ہے' خدا پرستی ہے' بھلا خدا پرستی کو ان معاملات سے کیا سروکار؟

نہیں جناب' اسلام میں خدا پرستی ان مسائل سے مربوط ہے۔ اسلام عبادت و پرستش اور دوسرے مسائل کے درمیان تفریق کا قائل نہیں۔

(ممکن ہے کوئی کہے کہ) میں نماز پڑھتا ہوں' لیکن نماز کے دوران گریہ بھی کرنا چاہتا ہوں۔ میں مصیبت میں مبتلا ہوں' پریشانی کا شکار ہوں' چاہتا

ہوں کہ نماز کے درمیان کچھ آنسو بہالوں۔ یا کوئی بات میرے ذہن میں آ جائے' کوئی چیز دیکھوں اور ہنس پڑوں (اگر ایسا کروں) تو کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔

نہیں جناب' ایسا نہیں ہے۔ نماز احساسات کو ضبط کرنے کا مظہر ہے' حالتِ نماز میں جب آپ ایک نقطے کی سمت متوجہ ہوں تو اسی نقطے کی سمت متوجہ رہنا چاہیے۔ نہ دائیں' نہ بائیں' نہ پیچھے' حتیٰ اپنا سر ادھر ادھر گھمانے کا بھی حق نہیں' ایک چوکس (Alert) حالت میں کھڑے ہونا چاہیے۔

کیا نماز میں ہنسا اور رویا جا سکتا ہے؟

نماز کے دوران کھانے پینے کا حکم کیا ہے؟

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی چیز عبادت کی روح سے متصادم نہیں۔ خدا کو یاد کر رہے ہیں ساتھ ساتھ ہنسی آ رہی ہے' ہنسنا چاہتے ہیں۔ رونا آ رہا ہے' رونا چاہتے ہیں۔ یا دورانِ نماز کوئی چیز کھانا چاہتے ہیں۔

نہیں جناب' آپ کو اس تھوڑی سی مدت کے لئے مشق کرنی چاہیے تاکہ اس دوران آپ کو اپنے پیٹ پر کنٹرول ہو' اپنی ہنسی پر کنٹرول ہو' اپنے رونے پر کنٹرول ہو' اپنی بے نظمی پر کنٹرول ہو۔ یہ اجتماعی مسائل میں سے ہے' لیکن عبادت ہے۔ کیونکہ اسلام میں عبادت' تربیتی اسکیم کا ایک حصہ ہے' اس اصول کی رعایت کیے بغیر مقبول نہیں۔

کیا سکون کے ساتھ جم کے کھڑے ہونا چاہیے؟

بعض کہتے ہیں کہ عجیب بات ہے!!! میں نماز کی حالت میں حمد اور سورے کی تلاوت کرتے ہوئے اسکی تمام شرائط کو ملحوظ رکھتا ہوں لیکن اگر اپنے جسم کو حرکت دوں' ایک پیر اٹھا کر دوسرے پیر پر رکھ لوں' اپنے آپ کو دائیں بائیں جنبش دوں' تو کہا جاتا ہے کہ تمہاری یہ نماز باطل ہے۔ رکوع یا سجود میں بھی اگر اپنے آپ کو ہلاؤں جلاؤں' اپنے پیروں یا ہاتھوں کو حرکت دوں' تو کہتے ہیں کہ تمہاری یہ نماز باطل ہے۔ (کہتے ہیں) آرام اور سکون کے ساتھ نماز پڑھو۔ یعنی جب کھڑے ہو اور اللہ اکبر کہنا چاہو تو جب تک تمہارا بدن ساکت نہ ہو جائے اس وقت تک اللہ اکبر نہ کہو۔ اگر ہلتے ہوئے اللہ اکبر کہا تو نماز باطل ہوگی۔ پہلے سکون سے کھڑے ہو' پھر اللہ اکبر کہو۔ اسکے بعد اگر ہلنا ہو تو ہلو لیکن ہلتے وقت کوئی حرف زبان سے ادا نہ کرو' کوئی ذکر نہ کرو۔ اگر بالفرض تمہارے پاؤں میں درد ہو' یا تمہارے کسی اور عضو میں تکلیف ہو تو خاموش ہو جاؤ' پر سکون ہو جاؤ' جب ٹھہر جاؤ تو پھر ذکر شروع کرو بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہو۔ اگر نماز کے درمیان تمہارے پاؤں میں تکلیف ہو' تو ٹھہر جاؤ' خاموش ہو جاؤ' اسکے بعد دوبارہ وہیں سے شروع کرو۔

(نماز) سکون اور اطمینان کے ساتھ ہونی چاہئے۔ اس دوران تمہاری روح بھی پر سکون ہو اور تمہارا جسم بھی۔

آتے ہیں نماز کے دوسرے حصوں کی طرف۔

نماز خدا کی جانب توجہ کا نام ہے۔ غیر خدا کی جانب توجہ شرک ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم سے کہا گیا ہے کہ نماز میں کہو: اَلسَّلامُ عَلَیْنا وَعَلیٰ عِبادِ اللّٰہِ الصَّالِحِینَ ' (ہم پر اور تمام صالح بندگانِ خدا پر ہمارا سلام ہو) اس طرح ہم خدا کے تمام صالح اور نیک بندوں سے یکجہتی' موافقت اور صلح وصفا کا اعلان کرتے ہیں۔ آج کی اصطلاح میں تمام اچھے لوگوں کے ساتھ مل جل کے باہمی محبت اور سلامتی کے ساتھ رہنے کا اعلان کرتے ہیں۔ حالتِ نماز میں کہتے ہیں کہ ہم کسی صالح بندۂ خدا سے دشمنی اور عداوت نہیں رکھتے۔ کیونکہ اگر ہم کسی صالح اور نیک انسان سے دشمنی اور عداوت رکھتے ہوں تو (اسکے معنی یہ ہیں کہ ہم) خود صالح اور نیک نہیں۔

کچھ لوگوں کے خیال میں: اَلسَّلامُ عَلَیْنا وَعَلیٰ عِبادِ اللّٰہِ الصَّالِحِینَ کہنا بھی عبادت کی روح' (جو بارگاہِ الٰہی میں حضورِ قلب کا اظہار ہے) سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں عبادت کی روح اور جسم تربیتی مسائل سے گندھے ہوئے ہیں۔

نماز پروردگار سے قرب کی سواری ہونے کے ساتھ ساتھ' تربیت کا مکتب ومدرسہ بھی ہے۔ معنوی اور روحانی مسائل کے لحاظ سے انسان جتنا اپنے آپ کو اور دوسروں کو فراموش کرے بہتر ہے لیکن اجتماعی نکتۂ نظر سے دوسروں

کو فراموش نہ کرنا لازم اور ضروری ہے۔

سورہ حمد (۱) جو نماز کا لازمی جز ہے اس میں ہم کہتے ہیں: اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۔ یہ نہیں کہتے کہ: ایاک اعبدو ایاک استعین۔ ایاک اعبد 'اصطلاحاً متکلم واحد ہے' اس کے معنی ہیں کہ خدایا! میں صرف تیری پرستش کرتا ہوں' صرف تجھ سے مدد لیتا ہوں' لیکن ہم یہ نہیں کہتے' بلکہ کہتے ہیں: اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ 'یعنی خدایا ہم صرف تیری پرستش کرتے ہیں' صرف تجھ ہی سے مدد و استعانت طلب کرتے ہیں۔ یعنی کہتے ہیں: خدایا! میں تنہا نہیں ہوں' میں دوسرے تمام مسلمانوں کے ساتھ ہوں۔

اس طرح انسان عبادت کی حالت میں اسلامی معاشرے سے اپنی وابستگی اور پیوستگی کا اظہار کرتا ہے۔ کہتا ہے: خدایا میں ایک فرد نہیں ہوں' ایک نہیں ہوں' میں عضو ہوں' کل کا ایک جز اور ایک بدن کا حصہ۔ ''ہم'' ہوں ''میں'' نہیں ہوں۔ دنیائے اسلام میں ''میں'' نہیں پایا جاتا ''ہم'' پایا جاتا ہے۔ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں' صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

خدا کی کبریائی

نماز کے دوسرے حصے بھی اسی طرح ہیں' ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک درس ہے' تذکر اور یاددہانی ہے۔

۱۔ ہر نماز میں سورہ حمد پڑھنا ضروری ہے۔ لا صلوۃ الا بفاتحۃ الکتاب (بغیر سورۃ فاتحہ کے نماز درست نہیں) دوسرے سورے کی جگہ پر کسی بھی سورے کا انتخاب کیا جا سکتا ہے لیکن سورہ حمد پڑھنا لازم ہے۔

مثلاً آپ "اللہ اکبر" کے لفظ پر غور کیجئے۔

آخر وہ کونسا انسان ہے جو کسی عظیم شے کا سامنا ہونے پر اس سے مرعوب نہ ہو؟ انسان میں خوف پایا جاتا ہے۔۔۔ جب وہ کسی پہاڑ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے یا اسکی چوٹی پر کھڑے ہو کر نیچے نگاہ ڈالتا ہے' تو اس پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ سمندر کی بپھری ہوئی موجیں دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ جب کسی صاحبِ قدرت وہیبت ہستی کو دیکھتا ہے' دبدبے اور جاہ وحشم کی مالک کسی ہستی کا سامنا کرتا ہے' یا اسکی خدمت میں جاتا ہے' تو ممکن ہے اسکے حواس باختہ ہو جائیں' اسکی زبان میں لکنت آ جائے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اس لئے کہ وہ اس کی عظمت وہیبت سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کے لئے ایک طبیعی بات ہے۔

لیکن اللہ اکبر کہنے والا شخص' ایسا شخص جو اپنے آپ کو خدا کی کبریائی کی تلقین کرتا ہے' اسے کسی چیز یا کسی ہستی کی عظمت مرعوب نہیں کرتی۔ کیوں؟ کیونکہ "اللہ اکبر" یعنی ہر چیز سے بڑی بلکہ ہر توصیف سے بڑی ذات' ذاتِ اقدسِ الٰہی ہے' یعنی اس بات کا اظہار کہ میں خدا کو عظیم سمجھتا ہوں' اور جب میں خدا کو عظیم سمجھتا ہوں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ میرے سامنے اس کائنات کی تمام اشیا حقیر ہیں۔ اللہ اکبر کا لفظ انسان کو شخصیت عطا کرتا ہے' انسان کی روح کو بزرگی

اور بلندی عطا کرتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: عَظُمَ الْخَالِقُ فِي أَنْفُسِهِمْ فَصَغُرَ مَا دُونَهُ فِي أَعْيُنِهِمْ (خالق ان کی نگاہ میں اس قدر عظیم ہے کہ ساری دنیا ان کی نگاہوں سے گر گئی ہے۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۱) یعنی خدا اہل حق کی روح میں جلوہ افروز ہے لہٰذا ان کی نظر میں خدا کے سوا ہر چیز پست اور معمولی ہے۔

اس مقام پر آپ کے لئے ایک وضاحت عرض ہے:

چھوٹا اور بڑا ہونا ایک نسبی (Relative) امر ہے۔ مثلاً آپ حضرات جو اس ہال میں تشریف فرما ہیں' اگر یہاں آنے سے پہلے' اس سے ایک چھوٹے ہال میں (مثلاً اس سے ایک تہائی چھوٹے ہال میں) بیٹھے ہوئے تھے' تو یہ ہال آپ کو بہت بڑا محسوس ہوگا' لیکن اگر اسکے برعکس' پہلے آپ ایک ایسے ہال میں بیٹھے ہوں جو اس ہال سے تین گناہ بڑا تھا تو جب وہاں سے یہاں آئیں گے تو آپ کو یہ ہال بہت چھوٹا معلوم دے گا۔

انسان جب کبھی مختلف چیزوں کی چھوٹائی اور بڑائی کا موازنہ کرتا ہے تو ان میں چھوٹی دکھائی دینے والی چیزوں کو چھوٹا اور بڑی نظر آنے والی چیزوں کو بڑا قرار دیتا ہے۔ لہٰذا ایسے افراد جو اپنے پروردگار کی عظمت و بزرگی سے آشنا ہیں اور اسکی عظمت کو محسوس کرتے ہیں' ان کی نظر میں خدا کے سوا ہر چیز حقیر اور

چھوٹی ہے' بڑی نہیں ہو سکتی۔ سعدی نے بوستان میں بہت عالی بات کی ہے:

بر عارفان جز خدا ہیچ نیست

رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست

سعدی کہتے ہیں: اہل عرفان' خدا کے سوا کسی چیز کی حیثیت کے قائل نہیں' وہ کہتے ہیں کہ کسی اور چیز کا سرے سے وجود ہی نہیں۔

"وحدت الوجود" کے ایک معنی یہی ہیں کہ جب عارف کے سامنے خدا کی عظمت اور بزرگی واضح ہو جاتی تو وہ کسی بھی صورت میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسکے سوا کسی اور چیز کا بھی وجود ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر "وہ" وجود ہے تو "اس" کے سوا جو کچھ ہے وہ عدم ہے۔ سعدی نے بھی وجود کے یہی معنی بیان کئے ہیں۔ بعد میں کہتے ہیں:

تو ان گفتن این با حقایق شناس

ولی خردہ گیرند اہل قیاس

حقیقت شناس لوگ جانتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں' لیکن وہ لوگ جو (ان کے خیال میں) اہلِ قیاس ہیں وہ ان پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وحدت الوجود کس شئے کا نام ہے؟

کہ پس آسمان و زمین چیستند

بنی آدم و دیو و دد کیستند

اگر خدا کے سوا کسی اور چیز کا وجود نہیں' تو پھر زمین کیا ہے؟ آسمان کیا ہے؟ بنی آدم کیا ہے؟ دیو اور دو کیا ہے؟

پسندیدہ پرسیدی ای ھوشمند — جوابت بگویم درایت پسند
کہ خورشید و دریا و کوہ و فلک — پری و آدمیزاد و دیو و ملک
ھمہ ہرچہ ہستند از آن کمترند — کہ با ہستیش نام ہستی برند

کہتے ہیں: میں جب یہ کہتا ہوں کہ خدا کے سوا کچھ اور نہیں ہے تو اسکا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آسمان و زمین' انسان اور فرشتے کسی بھی شے کا وجود نہیں۔ تم کہتے ہو کہ میں دوسری اشیا کے وجود کا منکر ہو گیا ہوں' نہیں' ایسا نہیں ہے بلکہ اس (خدا) کی عظمت کو جان لینے کے بعد میں اسکے سوا جس چیز کو بھی دیکھتا ہوں اسے ہستی قرار دینے سے خود کو عاجز پاتا ہوں۔

کہ جای کہ دریاست من چیستم
گر او ہست حقا کہ من نیستم

جب آپ ''اللہ اکبر'' کہتے ہیں تو اگر اپنی روح اور دل کی گہرائی سے کہیں گے تو خدا کی عظمت آپ کے سامنے مجسم ہو جائے گی۔ اگر آپ کے دل میں خدا کی عظمت و بزرگی پیدا ہو جائے تو پھر آپ کی نظر میں کسی اور کا عظمت و بزرگی کا حامل ہونا محال ہو گا' محال ہے کہ آپ کسی اور سے خوف کھائیں' کسی اور کے سامنے خضوع و خشوع کا اظہار کریں۔

یہی وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ خدا کی بندگی انسان کو آزادی عطا کرتی ہے۔ اگر انسان خدا کی عظمت اور بزرگی کو جان لے تو اسکا بندہ بن جاتا ہے اور خدا کی بندگی کا لازمہ خدا کے سوا ہر کسی سے آزادی ہے:

نشوی بندہ تا نگردی حر   نتوان کرد ظرف پر را پر

چند گوئی کہ بندگی چہ بود   بندگی جز شکندگی نبود

خدا کی بندگی غیر خدا کی بندگی سے آزادی کے مترادف ہے۔ کیونکہ خدا کی عظمت اور بزرگی کے ادراک کا لازمہ غیر خدا کی حقارت اور اسکے بے قیمت ہونے کا ادراک ہے۔ اور جب انسان غیر خدا کو' خواہ وہ کوئی بھی ہو' حقیر اور معمولی سمجھنے لگے تو محال ہے کہ جانتے بوجھتے کسی حقیر کی بندگی کرے۔ حقیر کی بندگی کو انسان غلطِ عظیم سمجھتا ہے۔

نماز کے دوسرے اذکار جیسے **سبحان اللہ' الحمد للہ' سبحان ربی العظیم و بحمدہ' سبحان ربی الاعلیٰ و بحمدہ** اور تشہد وغیرہ' ہر ایک میں ایک رمز اور راز پوشیدہ ہے۔

ایک شخص نے حضرت علی علیہ السلام سے سوال کیا: ہم (نماز کی ہر رکعت میں) دو مرتبہ سجدہ کیوں کرتے ہیں؟ جس طرح ایک مرتبہ رکوع کرتے ہیں اسی طرح ایک مرتبہ سجدہ کر لیں!!!؟

البتہ آپ جانتے ہیں کہ سجدے میں رکوع سے زیادہ خضوع و خشوع اور

عاجزی وانکساری کا اظہار پایا جاتا ہے۔ کیونکہ سجدے میں انسان اپنے عزیز ترین عضو (انسان کا بلند ترین عضو سر ہے' جس میں انسان کا مغز ہوتا ہے اور سر میں بھی عزیز ترین نقطہ پیشانی ہے) کو عبودیت اور بندگی کے اظہار کے طور پر پست ترین چیز یعنی خاک پر رکھتا ہے۔ اپنی پیشانی خاک پر رگڑتا ہے اور اس طرح اپنے پروردگار کے سامنے اپنے معمولی اور حقیر ہونے کا اظہار کرتا ہے۔

اس شخص نے کہا: ہم نماز کی ہر رکعت میں دو مرتبہ سجدہ کیوں کرتے ہیں' خاک میں کیا خصوصیت پائی جاتی ہے؟

امیر المومنین نے (اسکے جواب میں) یہ آیت پڑھی: مِنهَا خَلَقنَاکُمْ وَ فِيهَا نُعِيدُکُمْ وَ مِنهَا نُخرِجُکُمْ تَارَۃً اُخرىٰ (اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں پلٹا کے لے جائیں گے اور پھر دوبارہ اسی سے نکالیں گے ۔سورۂ طہٰ ۲۰۔ آیت ۵۵)۔ اور پھر فرمایا: پہلی مرتبہ سجدے میں سر رکھ کر جب اوپر اٹھاتے ہو تو اسکا مطلب اس بات کا اظہار ہے کہ: مِنهَا خَلَقنَاکُمْ (ہم سب خاک سے خلق ہوئے ہیں)' ہمارے اس پورے پیکر کی بنیاد خاک ہے' ہم جو کچھ بھی ہیں وہ اس خاک سے وجود میں آئے ہیں۔ جب دوسری مرتبہ اپنا سر خاک پر رکھتے ہو تو تمہارے ذہن میں یہ ہونا چاہیے کہ ایک دن تمہیں مر کر خاک میں واپس جانا ہے۔ اور جب دوبارہ خاک سے اپنا سر اٹھاتے ہو تو تمہارے ذہن میں ہونا چاہیے کہ ایک مرتبہ پھر اس خاک سے اٹھائے جاؤ گے۔

اہلِ خانہ کے حوالے سے ذمے داری

ایک اور نکتے کا ذکر کر کے اپنے عرائض ختم کروں گا:

میرا دل بہت چاہتا ہے کہ نماز جو دین کا ستون ہے ہم اسکی اہمیت کو جان لیں، سمجھ لیں۔ سب جانتے ہیں کہ ہم اپنے اہل خانہ کی نماز کے ذمے دار ہیں۔ یعنی اپنے بیوی بچوں کی نماز کے ذمے دار ہیں۔ ہم میں سے ہر فرد خود اپنی نماز کا بھی ذمے دار ہے اور اپنے اہل خانہ کی نمازوں کا بھی، یعنی اپنے بیوی بچوں کی نمازوں کا بھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہے: وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا. (۱)۔ اے پیغمبر! اپنے اہل خانہ کو نماز کی تاکید کیجئے اور خود بھی نماز کے بارے میں صابر رہئے۔ یہ (حکم) صرف پیغمبر سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہم سب اس بارے میں ذمے دار ہیں۔

بچوں (کو نماز کا عادی بنانے کے لئے ان) کے ساتھ کیا کرنا چاہئے؟

اس سلسلے میں بچوں کو بچپنے ہی سے نماز کی مشق کرانی چاہئے۔ شریعت کا حکم ہے کہ بچوں کو سات سال کی عمر سے نماز کی مشق کراؤ۔ ظاہر ہے کہ سات سالہ بچہ صحیح طور سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ البتہ وہ نماز کی حرکات وسکنات ادا کر سکتا ہے اسی عمر سے نماز کا عادی ہو سکتا ہے۔ (خواہ لڑکا ہو یا لڑکی)۔ یعنی جوں

۱۔ اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دیں اور اس پر صبر کریں۔ (سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۱۳۲)

ہی بچہ پرائمری کلاسوں میں آئے تو اسے اسکول میں نماز سکھانی چاہئے۔ گھر میں بھی اسے نماز سکھانا چاہئے۔ البتہ ایک بات پر توجہ رہے' اور وہ یہ کہ بچے کو بالجبر اور زبردستی نماز سکھانا' اسے اس طرح نماز پر آمادہ کرنا' نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔

کوشش کیجئے کہ آپ کے بچے ابتداء ہی سے شوق اور رغبت کے ساتھ نماز پڑھیں۔ آپ ان کے اندر نماز سے لگاؤ پیدا کریں' جس طرح بھی ممکن ہو بچوں کے لئے شوق کے اسباب فراہم کریں تاکہ وہ ذوق وشوق سے نماز پڑھیں۔ اس سلسلے میں ان کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کیجئے' انہیں انعام دیجئے' ان سے محبت کا اظہار کیجئے' یہاں تک کہ وہ سمجھنے لگیں کہ جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو آپ کے دل میں ان کے لئے محبت بڑھ جاتی ہے۔

مزید یہ کہ بچے کو ایسے ماحول میں لے جایئے جس میں اس کے اندر نماز پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔ تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ اگر بچہ مسجد نہ جائے' اگر اجتماع میں نہ جائے اور لوگوں کو اجتماعی طور پر نماز پڑھتے نہ دیکھے' تو اس میں نماز کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ درحقیقت اجتماع میں حاضری انسان میں شوق پیدا کرتی ہے۔ بڑی عمر کا انسان بھی جب اپنے آپ کو عبادت گزار لوگوں کے مجمع میں پاتا ہے تو اس میں بھی عبادت کی روح بڑھتی ہے' بچہ تو بڑے کی نسبت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔

افسوس کہ مساجد' عبادت گاہوں اور دینی محافل میں ہمارے کم جانے

اور بچوں کے بہت کم دینی اجتماعات میں شرکت کرنے کی باعث ان میں ابتداء ہی سے عبادت کی جانب رغبت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ رغبت پیدا کرنا آپ کی ذمے داریوں میں سے ہے۔

اسلام جو یہ کہتا ہے کہ اپنے بچوں کو نماز کی تلقین کرو تو اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ آپ آقاؤں کے سے انداز میں انہیں حکم دیں، ڈرائیں، دھمکائیں، ان کے سر پر سوار ہو جائیں۔ نہیں، بلکہ ہر اس ذریعے سے استفادہ کیجئے جس کے بارے میں آپ سمجھتے ہوں کہ آپ کے بچوں کو نماز کی جانب راغب کرنے اور انہیں اس کا شوق دلانے کے سلسلے میں مفید واقع ہوگا۔

ہمیں اپنے بچوں کے ساتھ مسجد جانے کا اہتمام کرنا چاہئے، تاکہ وہ مساجد اور عبادت گاہوں سے آشنا ہوں۔ خود ہم لوگ جو اپنے بچپنے ہی سے مساجد اور معابد سے آشنا تھے، اب آج کے ان حالات میں کس قدر مسجد جاتے ہیں؟ ہمارے بچے سات برس کی عمر سے اسکول جاتے ہیں، اسکول کے بعد کالج اور پھر یونیورسٹی لیکن کبھی انہوں نے مسجد میں قدم نہیں رکھا ہوتا، ایسی صورت میں کیا وہ مسجد جائیں گے؟ جی ہاں! یہ بچے لازماً مسجد سے دور رہیں گے۔ اس صورتحال میں کیا آپ یہ عذر پیش کرسکتے ہیں کہ مساجد کے حالات اچھے نہیں یا مثلاً (مذہبی اجتماعات میں) خطیب حضرات نامناسب باتیں کرتے ہیں (اس لئے ہم اپنے بچوں کو ان جگہوں سے دور رکھتے ہیں)۔ ان چیزوں (مسجدوں

اور منبروں) کو درست کرنا بھی ہمارا فریضہ ہے۔ فریضہ کسی مقام پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اپنی مساجد کی اصلاح بھی ہماری ذمے داری ہے۔

پس اس بات کو بھی کبھی فراموش نہ کیجیے گا کہ ہم پر خود اپنی نماز کی ادائیگی بھی فرض ہے اور اپنے اہلِ خانہ کو نماز کا عادی بنانا بھی ہمارا فریضہ ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہم ان میں نماز کی جانب رغبت اور لگاؤ پیدا کریں، جس قدر ممکن ہو نماز پڑھنے کے فوائد اور خصوصیات اور نماز کے فلسفے سے اپنے بچوں کو آگاہ کریں۔

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جب بعض اہلِ جہنم کو عذاب دیا جا رہا ہوگا تو ان سے پوچھا جائے گا: مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ (کس چیز نے تمہیں اس جہنم میں پہنچایا ہے) قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ (ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے) وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ (لغو باتوں کی جگہ پر جاتے تھے۔ سورۂ مدثر ۷۴۔ آیت ۴۲ تا ۴۵) جہاں کہیں بھی دین مخالف باتیں کی جاتی تھیں، وہاں جا کر انہیں سنتے تھے، یا خود ایسی باتیں کرتے تھے۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

یہاں سے سمجھ لیجیے کہ اسلام میں نماز کو اس قدر اہمیت کیوں حاصل ہے؟ کیوں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نماز اس خیمے کا ستون ہے؟ اسکی وجہ یہ ہے کہ اگر نماز قائم ہو اور اسکا صحیح صحیح اجرا ہو تو ہر چیز ٹھیک ہو جائے۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنی آخری وصیتوں میں' جنہیں آپ نے بارہا سنا ہوگا اور جو اللہ اللہ سے شروع ہوتی ہیں (یہ وصیتیں کرنے کے چند ہی لمحے بعد آپ نے جان' جان آفرین کے سپرد کر دی تھی) انہی وصیتوں میں آپ نے نماز کے بارے میں فرمایا: اللہَ اللہَ بِالصَّلاۃِ فَاِنَّھَا عَمُودُ دِینِکُمْ. (نماز کے بارے میں اللہ سے ڈرنا کیونکہ وہ تمہارے دین کا ستون ہے۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۴۷)

روزِ عاشورا کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا اور جانتے ہوں گے کہ زیادہ تر شہادتیں ظہر کی نماز کے بعد واقع ہوئیں۔ یعنی ظہر کے وقت تک حضرت امام حسین علیہ السلام کے اکثر اصحاب' تمام بنی ہاشم اور خود امام حسین (جو سب سے آخر میں شہید ہوئے) زندہ تھے۔ ظہر سے پہلے امام حسین کے فقط تیس اصحاب دشمن کی طرف سے ہونے والی ایک تیر اندازی میں شہید ہوئے تھے' وگرنہ امام کے لشکر کے باقی دوسرے افراد ظہر کے وقت تک بقید حیات تھے۔

اصحابِ امام حسین میں سے ایک شخص کو خیال آیا کہ ظہر کی نماز کی ادائیگی کا اول وقت آ پہنچا ہے۔ وہ امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: یا ابا عبداللہ! نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے' ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپ کی اقتدا میں آخری نماز جماعت ادا کریں' امام نے نظر اٹھا کر (آسمان کی طرف) دیکھا اور

نماز کا وقت ہو چکنے کی تصدیق کی۔ کہتے ہیں کہ فرمایا: ذَکَرْتَ الصَّلٰوۃَ یا ذَکَّرْتَ الصَّلٰوۃَ۔ اگر "ذَکَرْتَ" کہا ہو تو معنی ہوں گے کہ تمہیں نماز یاد آئی اور اگر "ذَکَّرْتَ" کہا ہو تو معنی کیے جائیں گے کہ تم نے مجھے نماز یاد دلائی ذَکَّرْتَ الصَّلٰوۃَ جَعَلَکَ اللّٰہُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ (تم نے نماز یاد دلائی' خدا تمہیں نماز گزاروں میں سے قرار دے)

تصور کیجئے کہ ایک ایسا شخص جو سربکف ہے' اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہے' ایسے مجاہد کے بارے میں امام دعا فرمارہے ہیں کہ خدا تمہیں نماز گزاروں میں سے قرار دے۔ دیکھا آپ نے حقیقی نماز گزار کتنا عظیم مقام رکھتا ہے۔

فرمایا: ہاں' ہم نماز پڑھیں گے' اسی جگہ میدان جنگ میں نماز پڑھیں گے۔

اس موقع پر ایسی نماز پڑھی گئی جسے فقہ میں "نماز خوف" کہا جاتا ہے۔ نمازِ خوف' مسافر کی نماز کی مانند چار رکعت کی بجائے دو رکعت ہوتی ہے۔ یعنی انسان اگر اپنے وطن میں بھی ہو تو اسے دو رکعت ہی پڑھنا چاہیے۔ کیونکہ حالات سازگار نہیں لہٰذا یہاں مختصر نماز پڑھنی چاہیے' اس لئے کہ تمام افراد کے نماز میں مشغول ہو جانے کی وجہ سے دفاع کی صورتحال خراب ہو جائے گی۔ سپاہیوں کا فرض ہے کہ اس نماز کے دوران آدھے سپاہی دشمن کا مقابلہ کریں اور آدھے امام جماعت کی اقتداء میں نماز پڑھیں۔ امام جماعت ایک رکعت

پڑھنے کے بعد ٹھہرتا ہے تاکہ مقتدی اپنی دوسری رکعت پڑھ لیں۔ اسکے بعد وہ جا کے اپنے دوسرے ساتھیوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ جبکہ امام اسی طرح بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرتا ہے۔ پھر دوسرے سپاہی آتے ہیں اور امام کی دوسری رکعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام نے اسی طرح نمازِ خوف ادا کی۔ لیکن امام کو ایک خاص صورتحال درپیش تھی۔ کیونکہ آپ دشمن سے زیادہ فاصلے پر نہ تھے۔ لہٰذا آپ کی حفاظت کرنے والا گروہ آپ کے بالکل سامنے کھڑا ہوا تھا' جبکہ بے حیا اور بے شرم دشمن نے انہیں نماز تک سکون سے نہ پڑھنے دی۔ آپ نماز میں مشغول تھے کہ دشمن نے تیراندازی شروع کر دی' آپ پر دو قسم کی تیراندازی کی گئی' ان میں سے ایک زبان کی تیراندازی تھی۔ دشمن کے ایک سپاہی نے چیخ کر کہا: حسین! نماز نہ پڑھو' تمہاری نماز کا کوئی فائدہ نہیں' تم اپنے زمانے کے امام (یزید) کے باغی ہو' لہٰذا تمہاری نماز قبول نہ ہو گی (نعوذ باللہ)۔ جبکہ دوسری تیراندازی معمول کے مطابق کمانوں سے پھینکے جانے والے تیروں کی تھی۔ امام حسین کے وہ ساتھی جنہوں نے اپنے آپ کو امام کی ڈھال بنایا ہوا تھا ان میں سے ایک دو اصحاب (تیر لگنے کی وجہ سے) خاک پر گر پڑے۔ ان میں سے ایک سعید بن عبداللہ حنفی اس وقت گرے جب امام حسین اپنی نماز تمام کر چکے تھے۔ وہ جانکنی کے عالم میں تھے کہ امام ان کے سرہانے پہنچے۔ انہوں نے

امام کو اپنے سرہانے دیکھ کر ایک عجیب جملہ کہا' عرض کیا: یـا ابـا عبـدا اللہ ! اوفیت (اے اباعبداللہ! کیا میں نے وفا کی؟) یعنی' اب اس حال میں بھی ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ امام حسین کا حق اس قدر بلند و بالا ہے کہ اس کی ادائیگی کے لئے ایسی گرانقدر فداکاری بھی شاید کافی نہ ہو۔

صحرائے کربلا میں ابو عبداللہ الحسین علیہ السلام نے اس انداز سے نماز ادا کی۔

اباعبداللہ نے اس نماز میں تکبیر کہی' ذکر کیا' سبحان اللہ کہا' بـحـول اللہ وقـوتـه اقوم واقعد کہا' رکوع وسجود کئے۔ اس نماز کے دو تین گھنٹے بعد امام حسین کے لئے ایک دوسری نماز پیش آئی' دوسرا رکوع پیش آیا' دوسرے سجود پیش آئے۔ ایک دوسرے انداز سے آپ نے ذکر کیا۔ آپ کا رکوع اس وقت ہوا جب ایک تیر آپ کے مقدس سینے میں اترا اور آپ اسے اپنی پشت کی طرف سے نکالنے پر مجبور ہوئے۔

کیا آپ کو پتا ہے کہ اباعبداللہ کے سجود کی کیا صورت تھی؟ آپ نے پیشانی پر سجدے نہیں کئے' کیونکہ آپ بے بس ہو کر گھوڑے سے زمین پر گرے تھے لہٰذا آپ نے اپنا دا ہنا رخسار کربلا کی گرم ریت پر رکھا۔

اس موقع پر اباعبداللہ کا ذکر تھا: بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ' وَلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِى الْعَظِيْمِ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى

مُحَمَّدٍ وَ آلِهِ الطَّاهِرِينَ."

بِسِمِکَ الْعَظِیمِ الاَعْظَمِ.

خدایا! ہماری عاقبت خیر فرما' ہم سب کو اپنی عبادت' عبودیت اور بندگی کی توفیق کرامت فرما۔

خدایا! ہمیں حقیقی نماز گزاروں میں سے قرار دے' ہم سب کی نیتوں کو خالص کردے۔ ہمیں شیاطینِ جن وانس کے شر سے محفوظ فرما۔

خدایا! ہم سب کے مرحومین کی مغفرت فرما۔

رَحِمَ اللّٰهُ مَنْ قَرَأَ اَلْفَاتِحَةَ مَعَ الصَّلَوات'

✿✿✿

نام کتاب : **عبادت ونما**

مؤلف : استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

ترجمہ : سید سعید حیدر زیدی

بشکریہ : دار الثقلین، ناظم آباد، کراچی۔

پیشکش : سید جاوید رضا نقوی

تاریخ اشاعت : اکتوبر ۲۰۱۲ء

تعداد اشاعت : ۱۰۰۰

سرورق ڈیزائننگ : سید امتیاز عباس

پرنٹنگ : العصر پبلشرز

یہ کتاب

عبادت ونماز

ہم اپنے پیارے

والدین

سید نوازش علی نقوی

ابنِ

سید حسین احمد نقوی (مرحوم)

سیدہ حسن بانو (چاندی)

بنتِ

سید اختر حسین زاہدی (مرحوم)

کی اٹھارویں برسی کے موقع پر محمدؐ وآلِ محمدؐ کی خدمت میں بطورِ ہدیہ پیش کر رہے ہیں پروردگارِ عالم محمدؐ وآلِ محمدؐ وشہدائے کربلاؑ کے صدقے میں یہ ہدیہ قبول فرما اوراس کی بدولت ہمارے مرحوم والدین کی مغفرت فرما اورانہیں اپنی رحمت کے سائے میں جوارِ معصومینؑ میں جگہ عطا فرما اور ان کے ذمہ رہ جانے والے حقوق کو درگذر فرما اوران کے درجات میں بلندی فرما۔ آمین

مومنین و مومنات سے ایک سورۂ فاتحہ کی استدعا ھے۔

سوگواران

سید جاوید رضا نقوی و برادران واہلِ خانہ